

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ
پڑھا اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا

تفہیم المسائل

﴿جلد دوم﴾

تصنیف

مفتی اعظم پاکستان چیئرمین رویت ہلال کمیٹی حضرت علامہ مولانا

مفتی منیب الرحمن مدظلہ العالی و حفظہ اللہ تعالیٰ

پیشکش

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

میں نے پبلشر ”ضیاء القرآن پبلی کیشنز“ سے شائع کردہ کتاب ”تفہیم المسائل (حصہ دوم)“

تالیف و تصنیف

پروفیسر علامہ مفتی منیب الرحمن صاحب کے پروف پوری توجہ سے پڑھے ہیں، میرے علم کے مطابق اس کتاب میں درج قرآنی آیات کے الفاظ اور اعراب غلطیوں سے مبرا ہیں۔

واللہ اعلم بالصواب

فقط

حافظ محمد ابراہیم فیضی

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله رب العلمين، والصلاة والسلام على رحمة للعالمين، سيدنا ومولانا محمد وعلی
 اله الطيبين الطاهرين وعلى صحابته الصديقين الكاملين، وعلى اولیاء امتہ وعلماؤ ملتہ
 من الفقهاء المجتهدين والمحدثين والمفسرين اجمعين

﴿حديث دل﴾

الحمد لله علی احسانہ ”تفہیم المسائل“ کے عنوان سے ہم نے روزنامہ ”ایکسپریس“ کی اشاعت جمعہ کے دینی صفحے پر سوال و جواب کا
 جو سلسلہ شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اسے قبول عام عطا فرمایا، ملک اور بیرون ملک دینی ذوق رکھنے والے قارئین کرام نے اس کی تحسین
 فرمائی۔ بعد میں ہم نے اس کی افادیت کے پیش نظر احباب کی خواہش پر کتابی شکل میں تفہیم المسائل (جلد اول) کے نام سے شائع کیا اور
 قلیل مدت میں اس کے چار ایڈیشن شائع ہو گئے، ہم اللہ تعالیٰ کے اس بے پایاں کرم اور اہل علم وقارئین کرام کی حوصلہ افزائی پر تشکر و ممنون
 ہیں۔

اب تفہیم المسائل جلد دوم پیش خدمت ہے، اس میں بعض نئے مفید اور دلچسپ مسائل ہیں، اس امر کا اندازہ آپ کو فہرست پر ایک
 طائرانہ نظر ڈالنے سے ہو جائے گا، ہمیں امید ہے انشاء اللہ العزیز قارئین اسے پسند فرمائیں گے۔ ہم نے سلسلہ تفہیم المسائل کی اشاعت کی
 ذمہ داری اہلسنت کے انتہائی موقر و ممتاز اشاعتی ادارے ”ضیاء القرآن پبلیکیشنز“ کو تفویض کی ہے۔ یہ ادارہ محسن اہلسنت منبع کرم حضرت
 علامہ جسٹس پیر کرم شاہ الازہری قدس سرہم العزیز کی باقیات صالحات میں سے ہے، اور یہ ”وہ شجرہ طیبہ ہے“ جس کی مہک و بہار میں
 روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ ادارے کے منتظم اعلیٰ صاحبزادہ حفیظ البرکات شاہ صاحب زید مجدہ گفتار و کردار، نفاس طبع، متوازن و متواضع
 مزاج، طبیعت میں ٹھہراؤ رچاؤ اور وقار و تمکنت میں، ”الْوَلَدُ سِرًّا لَا يَبْه“ کے مصداق، اپنے والد گرامی کا عکس ہیں، یہ حضرت قبلہ پیر
 صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کا فیضانِ نظر اور حسن تربیت ہے، بقول علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ۔

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی سکھائے جس نے اسماعیل کو آدابِ فرزند

اللہ کرے وہ اسی روش پر ہمیشہ قائم و دائم رہیں اور ترقی کی منازل طے کرتے رہیں۔ مشاغلِ کثیرہ کے سبب بعض اوقات ہم روزنامہ ایکسپریس میں اپنا ہفتہ وار کالم تسلسل کے ساتھ اور بلا ناغہ جاری نہیں رکھ سکے، قارئینِ کرام سے گزارش ہے کہ وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مصروفیت کا رے ایسی فراغت عطا فرمائے کہ اس مشن کو تسلسل اور تندہی سے جاری رکھ سکیں۔

ہم پیش آمدہ دینی مسائل کے حل کیلئے شیخ الحدیث علامہ غلام رسول سعیدی مدظلہم کی تفسیرِ تبیان القرآن اور شرح صحیح مسلم سے بھی استفادہ کرتے رہتے ہیں اور براہِ راست بھی ان سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ان کا وجود اہلسنت و جماعت کیلئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے، انہوں نے تحریری میدان میں جو علمی شاہکار تخلیق کیے ہیں، مجھے امید ہے وہ آئندہ صدیوں بلکہ ہزار یوں تک مطلعِ علم پر آفتابِ نصف النہار کی طرح ضوِ فلقن رہیں گے، جبکہ ان سے بغض و حسد رکھنے والوں کا نام و نشان تک باقی نہیں رہے گا ارشاد باری تعالیٰ حق اور سچ ہے:

﴿الرعد: 17﴾ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ج وَأَمَّا يُنْفَعُ النَّاسَ فَيَمُكُّ فِي الْأَرْضِ

(ترجمہ) ”یعنی جھاگ تو بے فائدہ ہونے کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے، لیکن جو چیز انسانیت کیلئے نفع رساں ہوتی ہے، (اللہ تعالیٰ کی توفیق سے) وہ زمین میں قرار و دوام پاتی ہے۔“

آپ بھی ہمارے ساتھ اس دعا میں شریک ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے طفیل علامہ محترم کو اپنی تمام تر جسمانی، فکری، علمی اور عقلی قوی کی سلامتی کے ساتھ تادیر اپنے دینِ متین کی خدمت کی توفیق و سعادت عطا فرمائے۔

ممکن ہے مجھ سے کسی مسئلے کے تفہیم یا تفہیم میں خطا ہو گئی ہو، اگر کوئی صاحبِ علم ہماری کسی خطا پر مطلع ہوں تو ازراہِ کرم میری اصلاح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں، ہم ان کے ممنون رہیں گے۔

میں مولانا محمد ابراہیم فیضی اور مولانا محمد ناصر خان چشتی کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ان منتشر و متنوع مسائل کی ترتیب و تدوین اور تبویب میں تعاون فرمایا اور تصحیح کی ذمہ داری کو بھی احسن طریقے سے نبھایا۔ اسی طرح ان فتاویٰ کا ریکارڈ محفوظ رکھنے میں مولانا منور احمد نعیمی کا تعاون بھی شامل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب کو ماجور فرمائے۔

انشاء اللہ العزیز! ”تفہیم المسائل“ کی آئندہ مجلدات بھی آتی رہیں گی۔ آخر میں ہم بہ صد عجز و نیاز و بہ غایتِ خلوص اللہ جل شانہ، سبحانہ و تعالیٰ کی بارگاہِ بے کس پناہ میں ملتی ہیں کہ وہ اپنے حبیبِ کریم ﷺ کے طفیل اس سعیِ ناتمام کو اپنے حضورِ عالی شان میں مقبول و ماجور فرمائے اور اہل علم، اربابِ فکر و نظر اور دینی مطالعے کا ذوق رکھنے والے قارئین کی نظر میں اسے وقعت و تکریم عطا فرمائے۔ آمین۔

﴿کتاب العقائد﴾

اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کرنا

سوال:

ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ بعض علماء اللہ تعالیٰ کیلئے واحد کا صیغہ استعمال کرتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے، وغیرہ، جبکہ اس کے برعکس بعض دیگر علماء ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ اسے فرطِ ادب سے تعبیر کرتے ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، وغیرہ۔ اس میں کونسا طریقہ درست ہے، کیا اللہ تعالیٰ کیلئے جمع کے صیغے کے استعمال سے شرک کا ایہام تو نہیں ہوتا؟ مدلل و مفصل تحریر کیجئے۔ ﴿مولانا محمد ناصر خان چشتی..... R-618 بلاک 14، فیڈرل بی ایریا، کراچی﴾

جواب:

قرآن مجید میں ہمیں یہ دونوں باتیں ملتی ہیں۔ قرآن مجید کا عمومی اسلوب اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت کیلئے واحد کے صیغے کا استعمال ہے،

مثلاً: **اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ، هُوَ اللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ**، وغیرہ۔ لیکن بعض مقامات پر جمع کے صیغے کا استعمال بھی ہے،

مثلاً: **”أَنَا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“**، (الحجر: ۹)

ترجمہ: ”بلاشبہ ہم ہی نے ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔“

قرآن مجید میں دس مقامات پر ”نَزَّلْنَا“ (ہم نے اتارا)، دو مقامات پر ”نَزَّلْنَاهُ“ (ہم نے اسے اتارا)، ایک مقام پر ”نَزَّلَهُ“ (اس نے اسے اتارا)، ایک مقام پر ”نُنَزِّلُهُ“ (ہم اسے اتارتے ہیں)، چالیس مقامات پر ”أَنْزَلْنَا“ (ہم نے اتارا)، چودہ مقامات پر ”أَنْزَلْنَاهُ“ (ہم نے اسے اتارا)، ایک مقام پر ”أَنْزَلْنَاهَا“ (ہم نے اسے اتارا)، کے کلمات مبارکہ آئے ہیں، ان کے علاوہ ”عَبَدْنَا“ (ہمارے بندے)، ”لَطَمُسْنَا“، ”نَطْمِسُ“ (ہم مٹا دیں گے)، ”حَشَرْنَا“ (ہم نے جمع کیا)، ”وَاعَدْنَا“ (ہم نے وعدہ کیا)، ”أَنْبَتْنَا“ (ہم نے اگایا)، ”ظَلَّلْنَا“ (ہم نے سایہ کیا)، ”نَحْنُ الْمُنْزِلُونَ“ (ہم اتارنے والے ہیں)، ”بَيْنَا“ (ہم نے وضاحت سے

بیان کیا) ”مَنْزِلَيْنِ“ (ہم اتارنے والے ہیں) ”صَرَفْنَا“ (ہم نے پھیرا) ”سُقْنَاهُ“ (ہم نے چلایا) ”لُبَيْنِ“ (تاکہ ہم واضح طور پر بیان کریں) ”اَسْكَنَاهُ“ (ہم نے ٹھہرایا) ”مُنْذِرَيْنِ“ (ڈرانے والے) ”وَضَعْنَاهُ“ (ہم نے (بوجھ) اتارا) ”اَرْسَلْنَاهُ“ (ہم نے بھیجا) ”اَسْقَيْنُكُمُوهُ“ (ہم نے تمہیں وہ پلایا) وغیرہ، تو قرآن مجید میں ذات باری تعالیٰ کیلئے واحد و جمع دونوں کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی ۶۰۶ھ سورۃ الحجرات آیت نمبر ۹ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

”ہر چند کہ یہ جمع کا صیغہ ہے لیکن بادشاہوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنی عظمت کے اظہار کیلئے خود کو جمع کے صیغے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، کیونکہ ان میں سے جب کوئی ایک کام کرتا ہے یا کوئی بات کہتا ہے تو وہ اس کو یوں کہتا ہے کہ ہم نے یہ کام کیا یا ہم نے یہ بات کہی۔“

﴿تفسیر کبیر، ج ۷، ص ۱۲۳، مطبوعہ دار الحیاء والتراث العربی، بیروت﴾

ہماری فہم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بالعموم اپنی احدیت، وحدانیت اور فردیت (یکتائی) کو اجاگر فرمایا ہے، بعض مقامات پر اس نے اپنی عزت و جلالت سطوت و شوکت، ہیبت و دبدبہ اور قدرت کاملہ محیطہ کے اظہار کیلئے جمع کے کلمات بھی استعمال فرمائے ہیں۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

اللہ عز و جل کو ضمائر مفرد سے یاد کرنا مناسب ہے کہ وہ واحد، احد، فرد، وتر ہے اور تعظیماً ضمائر جمع میں بھی حرج نہیں، اس کی نظیر قرآن میں ضمائر متکلم میں تو صد ہا جگہ ہے، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ، اور ضمائر خطاب میں صرف ایک جگہ ہے، وہ بھی کلام کافر سے کہ عرض کرے گا: ”رَبِّ اَرْجِعُوْنَ اَعْمَلْ صَالِحًا“، اس میں بھی علماء نے تاویل فرمادی ہے کہ یہ ”اَرْجِعْ“ کی جمع باعتبار تکرار ہے یعنی اَرْجِعْ اَرْجِعْ اَرْجِعْ۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: بہر حال یوں کہنا مناسب ہے کہ ”اللہ تعالیٰ فرماتا ہے“، مگر اس میں کفر و شرک کا حکم کسی طرح نہیں ہو سکتا، نہ گناہ ہی کہا جائے گا، بلکہ خلافِ اولیٰ۔ ﴿فتاویٰ رضویہ ج ۶ ص ۱۳۷-۱۳۶ مطبوعہ مکتبہ رضویہ کراچی﴾

علامہ غلام جیلانی میرٹھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ”بشیر القاری شرح صحیح البخاری“ صفحات ۲۴۱ تا ۲۴۳ میں اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے، جو حضرات چاہیں مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض مقامات پر اپنے لیے جو جمع کے کلمات ارشاد فرمائے ہیں، وہ اس کی ذاتِ جلیل کے لئے خاص ہے، اس نے ایسے کلمات بندوں کی زبان سے بیان نہیں فرمائے، بلکہ جہاں بندوں کو اپنی بارگاہِ عالی کیلئے کچھ عرض کرنے کا حکم ہوا ہے، وہ کلمات مفردہ پر مشتمل ہے، مثلاً:

(۱) سورہ ”ال عمران“ آیت ۲۶، ۲۷ میں ”مَالِكِ الْمُلْكِ، تُؤْتِي، تَنْزِعُ، تُعِزُّ، تُذِلُّ، تُؤَلِّجُ، تُخْرِجُ، تَرْزُقُ سب مفرد کے صیغے ہیں۔

(۲) سورہ ”انعام“ آیت نمبر ۱۲ میں ”كَتَبَ“

(۳) اسی سورہ کی آیت میں ”شَهِيدٌ، قُلْ إِنَّمَا هُوَ اللَّهُ وَاحِدٌ“

(۴) آیت نمبر ۲۵ میں ”قُلْ هُوَ الْقَادِرُ“

(۵) سورہ ”یونس“ آیت نمبر ۳۴ میں ”قُلِ اللَّهُ يَبْدَأُ الْخَلْقَ“

(۶) سورہ ”الرعد“ میں ”قُلْ هُوَ رَبِّي“

(۷) سورہ ”الاسراء“ آیت ۲۴ میں ”قُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا“

(۸) اسی سورہ کی آیت نمبر ۸۰ میں ”قُلْ رَبِّ ادْخِلْنِي“

(۹) سورہ ”طہ“ آیت نمبر ۱۱۴ میں ”قُلْ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا“

(۱۰) سورہ ”المؤمنون“ آیت نمبر ۲۹ میں ”قُلْ رَبِّ انْزِلْنِي مُنزَلًا مُّبَارَكًا“

(۱۱) اسی سورہ کی آیت ۱۱۸ میں ”قُلْ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَأَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِينَ“

(۱۲) سورہ ”احلاص“ آیت نمبر ۱ میں ”قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ“.

اسی طرح قرآن مجید میں بارگاہ الوہیت سے تعلیم مومنین کیلئے دعا کے جتنے کلمات ارشاد فرمائے گئے ہیں، وہ سب کے سب مفرد کلمات ہیں، سورہ ”فاتحہ“ ہی میں ہے: ”إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ“ انبیاء کرام کی سب دعائیں مفرد کے صیغوں کے ساتھ ہیں، سورہ بقرہ کے آخر میں ہے، ”وَاعْفُ عَنَّا، وَاعْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا، وَأَنْصُرْنَا“، (یعنی ہمیں معاف فرما دے، ہمیں بخش دے، ہم پر رحم فرما، ہماری مدد فرما) سب مفرد کے صیغے ہیں۔

میں یہ ادعاء تو نہیں کرتا کہ تمام احادیث مبارکہ یا اکثر میرے مطالعے سے گذر چکی ہیں، لیکن جہاں تک میرا محدود مطالعہ ہے، رسول اللہ ﷺ سے اللہ تعالیٰ کے لئے جمع کا صیغہ ثابت نہیں ہے، تو بندوں کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اسلوب دعا اور رسول اللہ ﷺ کی سنت طیبہ میں ذات باری تعالیٰ کیلئے مفرد کلمات ہی ارشاد فرمائے ہیں۔

مولانا غلام جیلانی نے تو طنز و تعریض کے طور پر یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض حضرات کے اکابر نے اپنے لئے ننگ اسلاف، بندہ ظلوم و جہول، ناکارہ خلاق، کمترین خلاق کے کلمات استعمال فرمائے ہیں، تو کیا ان کے تلامذہ اور متوسلین اپنے ان اکابر کیلئے یہی کلمات استعمال کریں گے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جلالت کیلئے مفرد کا صیغہ ہی استعمال کرنا اولیٰ ہے، لیکن اگر کوئی جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے تو اسے شرک و بدعت یا گمراہی قرار دینا درست نہیں ہے، یہ بھی بہر حال مباح اور جائز ہے۔

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر

سوال:

ایک مقامی اخبار میں مفتی صاحب سے سوال کیا گیا کہ: میں نوافل پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو بخشنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح قرآن پاک کی تلاوت ختم قرآن کے بعد اس کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو بخشا جاسکتا ہے؟ نیز اس کے لئے کیا نیت کی جائے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ: نوافل ادا کر کے اس کا ثواب نبی اکرم ﷺ کو بخش دیں۔ اسی طرح قرآن کریم کو پڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے، کیا یہ اندازِ بیان مقامِ رسالت کے شایانِ شان ہے؟

﴿فضل واحد..... ضلع مردان، صوبہ سرحد﴾

جواب:

اصولی طور پر تو یہ مسئلہ درست ہے کہ رسول اللہ ﷺ بلکہ جمیع انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ایصالِ ثواب نہ صرف جائز بلکہ مستحسن امر ہے اور امتی کے لئے باعثِ سعادت ہے کہ وہ اپنی بدنی و مالی عبادات یعنی نوافل، تلاوت، اذکار و تسبیحات، تلاوتِ قرآن مجید، حج و عمرہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ایصالِ ثواب اپنے آقا و مولیٰ ﷺ کے لئے کرے، اور یہ بات بھی درست ہے کہ اس ایصالِ ثواب کے لئے کوئی مخصوص طریقہ کار اختیار کرنا ضروری نہیں ہے، نیت دل کے ارادے کا نام ہے۔ اس ایصالِ ثواب کی نیت سے یہ عبادات اور اعمال خیر انجام دیئے تو یہ بھی کافی ہے اور اختتامِ عبادت کے بعد لفظاً دعا کر کے ایصالِ ثواب کریں تو بھی احسن ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے لئے ”ثواب بخش دینا“ کا لفظ مقامِ نبوت کے شایانِ شان نہیں ہے، اس سے بے ادبی جھلکتی ہے۔ اُردو کی لغت فیروز اللغات میں بخشش کے معنی درج ہیں: ”انعام، عطیہ، معافی، غفور و درگزر“ اس لفظ کے معانی میں ”معافی اور درگزر“ مقامِ رسالت کے شایانِ شان نہیں ہیں کہ امتی ایسا کلمہ استعمال کرے۔ کیونکہ قرآن مجید میں سورہ بقرہ آیت: ۱۰۴ میں رسول اللہ ﷺ کیلئے ایسا ذمہ لفظ استعمال کرنے سے منع کر دیا گیا ہے، جس کا ایک معنی تو مقامِ رسالت کے موافق ہو لیکن دوسرا اور کا کوئی معنی ایسا ہو جسے کوئی بد عقیدہ اور گستاخ شخص توہین آمیز معنوں میں استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے بجائے ہمارے فقہاء کرام اور بزرگانِ دین نے ”إهداء“ (یعنی حضور ﷺ کے بارگاہ میں ثواب کا ہدیہ کرنا) کا کلمہ استعمال فرمایا ہے۔ یعنی اپنی عبادات اور اعمال خیر کا ثواب رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں ہدیہ پیش کرنا، یعنی یوں کہے کہ ”اے اللہ! میں اس کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو ہدیہ کرتا ہوں“ یا یہ کہے کہ ”یا رسول اللہ! میں اپنے اعمال کو آپ کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں۔ قبول فرمائیے۔“ اہل عقیدت نے کہا ہے کہ:

ادب گاہست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

رسول اللہ ﷺ کو سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سید المرسلین کہنا

سوال:

عرض یہ ہے کہ میرے حسب ذیل دو سوالات کا جواب از روئے قرآن و حدیث عنایت فرمائیں:

(۱) رسول اللہ ﷺ کو مولائے کل، سرکارِ دو عالم، سرورِ کائنات، سرورِ کونین اور سید المرسلین کہا جاتا ہے۔ اگر رسول اللہ ﷺ میں یہ تمام صفات ہیں تو پھر اللہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: محمد صرف نبی ہی تو ہیں اور ان سے پہلے بھی نبی گزر چکے ہیں یعنی تمام نبی برابر ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”اللہ کے علاوہ کوئی حاکم، حاجت روا اور معبود نہیں، اسی کی طرف سب کو لوٹنا ہے۔“ ﴿سورۃ مومن: ۳﴾

﴿خواجہ احمد بخاری..... ملیر، کراچی﴾

جواب:

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ بلاشبہ ان القابات کے اہل ہیں اور ان سب اعزازات کے حامل ہیں، قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات مبارکہ ہمارے اس دعوے کی روشن دلیل ہیں:

(۱) ”اور (اے حبیب یاد کیجئے!) جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور حکمت دے دوں، پھر تمہارے پاس ایک عظیم رسول آئے جو اس چیز کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہو، تو تم اس پر ضرور بہ ضرور ایمان لانا اور ضرور بہ ضرور اس کی مدد کرنا، فرمایا: کیا تم نے اقرار کر لیا اور میرے اس بھاری عہد کو قبول کر لیا؟ انہوں نے عرض کیا: ہم نے اقرار کر لیا، فرمایا: تم اس عہد پر گواہ ہو جاؤ اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں، پھر جو شخص اس کے بعد عہد سے پھر گیا، سو وہ لوگ فاسق ہوں گے۔“

﴿آل عمران: ۸۲-۸۱﴾

اس ارشادِ باری تعالیٰ کی رو سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں کے نبی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام سے عالم ارواح میں آپ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کا پختہ عہد و اقرار لیا، چنانچہ اس آیت کے تحت علامہ محمود آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں: ”ابن جریر نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت آدم یا ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے جس نبی کو بھی بھیجا تو اس سے یہ عہد لیا کہ اگر اس کی زندگی میں محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث کیا گیا تو وہ ان پر ایمان لائے گا ان کی نصرت کرے گا اور اپنی امت کو ان پر ایمان لانے کا حکم دے گا، آگے چل کر وہ مسند ابویعلیٰ کے حوالے سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم

آج اگر تمہارے درمیان موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے میری پیروی کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ ہوتا۔“

﴿روح المعانی ۳/۲۱۰-۲۰۹﴾

اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت و رسالت کو تمام مخلوق اور تمام انسانیت کے لیے عام فرمادیا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) یا ایہا النبی انا ارسلنک شاحدا ومبشرا ونذیرا O ﴿سبا: ۲۸﴾

”اے نبی ہم نے آپ کو شاہد اور (قیامت تک کے) تمام لوگوں کے لیے (رحمت الہی کی) بشارت دینے والا اور (عذاب الہی سے) ڈرانے والے بنا کر بھیجا ہے۔“

(۲) قل یا ایہا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً O ﴿الاعراف: ۱۵۸﴾

”کہہ دیجئے! اے لوگو! میں تم سب کی طرف رسول (مبعوث ہوا) ہوں۔“

(۳) وما ارسلنک الا رحمة للعالمین O ﴿الانبیاء: ۱۰۷﴾

”اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر ہی تو بھیجا ہے۔“

جہاں تک رسول اللہ ﷺ کے سید المرسلین، سرور کائنات اور سرور کونین ایسے القاب مبارکہ کا تعلق ہے تو حدیث کی معروف کتاب ”مشکوٰۃ المصابیح“ میں ”باب فضائل سید المرسلین صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ“ میں کتب احادیث کے حوالے سے متعدد روایات درج ہیں جن میں ہم چند کا ذکر سطور ذیل میں کر رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۱) وكان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس عامۃ۔

”اور (ماضی کی امتوں میں اللہ کی سنت یہ رہی کہ) ہر نبی بطور خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور مجھے سارے انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔“

(۲) ارسلت الی الخلق كافة۔

”مجھے ساری مخلوق کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔“

(۳) انا سید ولد ادم یوم القیمة ولا فخر و بیدی لواء الحمد ولا فخر وما من نبی یومئذ ادم فمن سواہ الا تحت

لوائی۔

”میں قیامت کے دن ساری اولادِ آدم کا سردار ہوں گا اور یہ بات میں فخر کے طور پر نہیں (بلکہ تشکر کے طور پر) کہہ رہا ہوں اور حمد باری تعالیٰ کا پرچم میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور اُس دن آدم اور ان کے علاوہ جو نبی بھی ہوگا وہ میرے ہی پرچم کے نیچے ہوگا۔“

(۴) انا قائد المرسلين ولا فخر وانا خاتم النبيين ولا فخر وانا اول شافع واول مشفع -

”میں تمام رسولوں کا قائد ہوں گا اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور میں خاتم النبیین ہوں اور یہ کوئی فخر کی بات نہیں، اور سب سے پہلے شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا اور میری ہی شفاعت سب سے پہلے (اللہ کی بارگاہ میں) مقبول ہوگی۔“

(۵) اذا كان يوم القيمة كنت امام النبيين و خطيبهم وصاحب شفاعتهم غير فخر -

”قیامت کے دن میں انبیاء کا امام ہوں گا اور ان کا ترجمان ہوں گا، اور ان کی شفاعت کا ذمہ دار ہوں گا اور یہ میں بطور فخر نہیں کہہ

رہا۔“

جہاں تک ”مولائے کل“ کے لقب کا تعلق ہے تو اس کا اطلاق بھی بلاشبہ جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

النبي اوليٰ بالمؤمنين من انفسهم۔ الاحزاب: ۶ ﴿﴾

”نبی مومنوں سے ان کی جانوں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“

’ولی‘ کے معنی قریب کے ہیں، یہ قرب مکانی بھی ہو سکتا ہے اور زمانی بھی، نسبت کا قرب بھی ہو سکتا ہے، محبت کرنے والا، دوست، نصرت کرنے والا، رشتہ داری، ملکیت، معاملات کا منتظم و نگران اور حاکم وغیرہ، یہ لفظ متعدد معانی پر مشتمل ہے، اسی سے ”مولیٰ“ بھی ہے، ”مولیٰ“ کے معنی ہیں مالک آقا، آزاد کردہ غلام، محبت کرنے والا، رشتہ دار وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ہم ”مولیٰ“ کہتے ہیں تو قرب، نصرت، محبت، تصرف و اختیار سب معنوں کو یہ شامل ہوتا ہے۔ اور قرآن مجید میں غیر اللہ پر بھی ”ولی“ کا اطلاق کیا گیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”تَوْقِينًا لِلّٰهِ اِنَّ كَا مَدَدًا رَّحِمًا“ اور اس کے بعد فرشتے بھی (ان کے) مددگار ہیں۔ ﴿التحریم: ۴﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ، جبریل امین اور صالح مومنین سب پر ”مولیٰ“ کا اطلاق کیا گیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ تو جبریل امین اور مومنین صالحین بلکہ سب انبیاء سے بڑا ہے تو آپ کو مولائے کل کیوں نہیں کہہ سکتے۔ سورہ احزاب کی مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ محمود آلوسی نے ”روح المعانی“ میں لکھا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقام ہے تو مومنوں پر واجب ہے کہ رسول کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب جانیں اور رسول کا حکم ان پر ان کے نفسانی تقاضوں سے زیادہ نافذ العمل اور مؤثر ہو، اور نبی کا حق ان پر ان کی جانوں کے حق سے زیادہ ہو۔

آپ کا یہ کہنا کہ تمام نبی برابر ہیں، قرآن کی رو سے درست نہیں، بلاشبہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ:

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ۔ البقرہ: ۲۸۵ ﴿﴾

(رسول اور تمام مومن یہ کہتے ہیں کہ) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے میں ہم رسولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ ایک پر ایمان لائیں اور دوسرے پر نہ لائیں، بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے سب رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ البتہ قرآن مجید خود رسولوں کے درمیان تفاوتِ مراتب کی تصدیق کرتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:-

تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض م منهم من كلم الله ورفع بعضهم درجات ط واتينا عيسى ابن مريم البينت وايدنه بروح القدس۔ ﴿البقرہ: ۲۵۳﴾

”یہ سب رسول، ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کسی کو (سب پر) درجوں میں بلندی عطا فرمائی۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں دیں اور روح القدس (جبریل) سے ہم نے ان کی مدد فرمائی۔“
مفسرین کرام کے مطابق ”ورفع بعضهم درجات (اور ان میں سے کسی کو) (سب پر) درجوں میں بلندی عطا فرمائی“ سے سید المرسلین ﷺ ہی مراد ہیں۔

آپ کا یہ ارشاد کہ اگر یہ تمام القاب رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں تو پھر اللہ کے لیے کیا ہے؟ جواباً گزارش ہے کہ اللہ جل شانہ اس عظیم المرتبت، رفیع الشان رسولِ مکرم کا خالق ہے، مالک ہے، معبود ہے، معبود ہے، مختار ہے اور یہ رسول عظیم اپنی اس تمام تر رفعتِ شان کے باوجود اس کے بندہ خاص ہیں، مخلوق ہیں، نیازمند ہیں۔ وہ رب العالمین، واجب الوجود ہے، ازلی ہے، ابدی ہے، وہ سب سے بے نیاز ہے، اور بشمول رسولِ کریم سب اس کے نیازمند اور محتاج ہیں۔ رحمۃ للعالمین ﷺ کی ساری رفعتیں، عظمتیں اور شانیں اس کی عطا سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضور کی تواضع کا عالم یہ ہے کہ آپ فرماتے ہیں:

عن عائشة رضی اللہ عنہا عن النبی ﷺ قال: سددوا وقاربوا وابشروا فانہ لا یدخل احدا الجنة عملہ، قالوا: ولا انت یا رسول اللہ؟ قال: ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ بمغفرة ورحمة۔ ﴿صحیح بخاری، رقم الحدیث: ۶۴۶۷﴾

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: راہِ راست پر چلو، اور اللہ کا قرب اختیار کرو اور (اجر و ثواب کی) بشارت دو، کیونکہ کسی کا عمل اسے جنت میں داخل نہیں کرے گا، (صحابہ نے) عرض کیا: یا رسول اللہ! آپ کی نجات کا مدار بھی عمل پر نہیں ہوگا؟ فرمایا: میرا بھی نہیں سوائے اس کے اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت و مغفرت سے ڈھانپ لے (یعنی اپنی آغوشِ رحمت میں پناہ دے دے)۔“

باقی رہا آپ کا یہ اشکال کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر ایسی صفات کا اطلاق کر دیا جائے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں تو کیا اس سے شرک لازم نہیں آئے گا۔ جواباً گزارش ہے کہ اس سے شرک بالکل لازم نہیں آئے گا، کیونکہ قرآن مجید میں متعدد ایسی صفات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے آئی ہیں جیسے رؤف، رحیم، عزیز، شہید، سمیع، بصیر وغیرہ، ان صفات کا اطلاق قرآن ہی میں رسول اللہ ﷺ پر بھی ہوا ہے۔ اسی طرح

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ابراء (شفادینا)، احیاء (زندہ کرنا)، خلق (پیدا کرنا) کی صفات کا اطلاق ہوا ہے، یہ قطعاً شرک نہیں بلکہ عین توحید ہے، کیونکہ جب یہ صفات جلیلہ اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہیں تو معنی یہ ہوتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات ہیں، ان کا مصدر منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، کسی اور سے مستعار یا مستفاد نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کے اپنی ذات و صفات میں مستقل بالذات ہونے کے عقیدے کو ”واجب الوجود“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے برعکس انبیاء کرام، رسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام میں یہ صفات ذاتی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

(۱) من ذا الذی یشفع عنده الا باذنه ۔ ﴿البقرة: ۲۵۵﴾

”کون ہے جو اس کی بارگاہ میں (کسی کی) شفاعت کرے، مگر جسے وہ خود اذن عطا فرمادے۔“

(۲) انی اخلق لکم من الطین کھیمۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیرا باذن اللہ ج و ابرئ الاکھمہ والابرص و احی الموتی باذن اللہ۔ ﴿آل عمران: ۴۹﴾

”میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے جیسی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے اذن سے اڑنے والا (پرندہ) بن جاتا ہے، اور میں اللہ کے اذن سے مادرزاد اندھے اور برص کے مریض کو شفاء دیتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔“

خلق، ابراء (شفایاب کرنا) اور احیاء (زندہ کرنا) اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، اگر کوئی اپنی ذات سے ان کا دعویٰ کرے یا کوئی ان امور کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی کمال سمجھے تو یہ شرک ہوگا۔ لیکن اگر یہی کمالات اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے کرنے کا دعویٰ کرے یا کوئی ان کی طرف منسوب کرے تو یہ عین توحید ہے۔ اسی طرح خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ ﷺ کے سارے کمالات اللہ تعالیٰ کے اذن و عطا سے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو ”اے حبیب!“ کہنے کا جواز؟

سوال:

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہاں اور کس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ایسے لفظ سے مخاطب کیا ہے، جس کے معنی ہیں اے حبیب، اور کیا اے نبی کا ترجمہ اے حبیب! معنی میں تصرف نہیں ہے اور کیا معنی کا تصرف یا تاویل جائز ہے؟

﴿خواجہ احمد بخاری..... C-78 الفلاح ہاؤسنگ پروجیکٹ ملیر ہالٹ﴾

جواب:

مشکوٰۃ المصابیح میں باب فضائل سید المرسلین میں سنن دارمی اور جامع ترمذی کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک طویل حدیث نقل کی گئی ہے، وہ فرماتے ہیں:

”(ترجمہ) رسول اللہ ﷺ کے کچھ احباب بیٹھے ہوئے تھے، حضور ﷺ، باہر تشریف لائے یہاں تک کہ ان کے قریب ہو گئے۔ آپ نے سنا کہ صحابہ آپس میں مذاکرہ کر رہے تھے، ان میں سے کسی نے کہا بیشک اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل (دوست) بنایا ہے، دوسرے نے کہا: موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے کلام کیا ہے، ایک اور نے کہا: عیسیٰ علیہ السلام کا کلمہ اور اس کی (جانب سے مقدس) روح ہیں۔ ایک اور نے کہا: آدم کو اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے، تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس گئے اور فرمایا: میں نے تم سب کی گفتگو سن لی ہے اور (اس امر پر) تمہاری حیرت کو بھی نوٹ کیا کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں، ہاں ہاں وہ اسی شان کے (مالک) ہیں اور موسیٰ اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کرنے والے ہیں ان کی بھی یہی شان ہے، عیسیٰ اللہ کی جانب سے روح اور اس کا کلمہ ہیں اور بلاشبہ ان کی یہی شان ہے، اور آدم اللہ کے برگزیدہ و چنیدہ (Selected) ہیں اور ان کی یہی شان ہے، مگر سنو! میں اللہ کا حبیب ہوں۔“ تو اس حدیث مبارک میں حضور ﷺ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں، واضح رہے کہ ”حبیب“ اور ”محبوب“ ہم معنی ہیں۔ اسی طرح قرآن نے متعدد مقامات پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ متقین، متوکلین، صابریں، مقسطین، توایین، محسنین، مطہرین سے محبت فرماتا ہے اور حضور ﷺ تو ان سب کے سردار و امام ہیں بلکہ ان سب کو یہ شرف حضور کی نسبت غلامی سے ملا ہے، تو حضور ﷺ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے سب سے قریب درجے میں محبوب ہیں۔ اس لیے حضور کو اللہ تعالیٰ کا حبیب یا محبوب کہنا درست ہے۔ کیونکہ جس سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کے حبیب یا محبوب کا اطلاق بالکل درست ہے۔

باقی ”يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ!“ کا معنی کسی نے ”اے حبیب!“ یا ”اے محبوب!“ نہیں کیا، بلکہ اُس کا ترجمہ سب نے ”اے نبی!“ کیا ہے، بعض مفسرین و مترجمین کرام نے اس کا ترجمہ ”اے (غیب بتانے والے) نبی!“ کیا ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ لفظ ”نبی“ کے ایک معنی ہیں ”غیب کی خبر دینے والا۔“ البتہ جہاں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو ”قُل“ کے کلمے کے ساتھ مخاطب فرمایا جس کے معنی ہیں کہو، کہہ دو، کہئے، کہہ دیجئے، اس میں ضمیر مخاطب مستتر (پوشیدہ) ہے، یعنی ”أَنْتَ“ (تو، تم) اور ظاہر ہے اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، تو اس کا ترجمہ کہہ دیجئے ”اے نبی!“ ”اے رسول!“ ”اے محمد ﷺ!“ یا ”اے حبیب!“ یا ”اے محبوب!“ کرنا درست ہے اور صرف کہو یا کہہ دو یا کہہ دیجئے کر دیں تو تب بھی درست ہے۔

کیا درودِ تاج پڑھنا شرک ہے؟

سوال:

ہمارے لوگ درودِ تاج، درودِ لکھی، دعائے گنج العرش اور اس طرح کے دیگر اوراد و وظائف بڑے شوق سے اور ثواب کی نیت سے پڑھتے ہیں۔ کیا یہ واقعی کارِ ثواب ہے؟ ایک مقامی اخبار میں لکھا ہے کہ درودِ تاج پڑھنا شرک ہے، دعائے گنج العرش نام ہی مہمل ہے، ان کی کوئی سند نہیں ہے اور انہیں پڑھنے والا وعید کا حقدار ہے، وغیرہ۔ ﴿محمدنا صرخان چشتی، گلشن اقبال..... حافظ محمد شمیم، قیوم آباد﴾

جواب:

دروود تاج کو علماء عالمین اور صوفیاء کرام ہمیشہ وفور شوق اور محبت سے پڑھتے رہے ہیں۔ اہل اللہ کے ہاں اس کو بکثرت شوق سے پڑھا جانا ہی رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اس کی قبولیت کی روشن دلیل ہے۔ کسی ورد، وظیفہ، درود یا دعاء کا کتاب و سنت میں نہ ہونا اور بات ہے اور کتاب و سنت کے خلاف ہونا اور بات۔ یہ دونوں باتیں اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل جدا ہیں، لیکن اس سے سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیا جاتا ہے اور ہر چیز کے بارے میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ قرآن و سنت میں نہیں ہے، لہذا باطل ہے۔ قرآن و سنت میں مذکورہ دعائیں پڑھنا بلاشبہ کارِ ثواب اور برکت و سعادت کی بات ہے، لیکن قرآن و سنت کی کسی نصِ صریح میں یہ حکم نہیں کہ صرف وہی درود اور دعائیں پڑھنا جائز ہیں جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں اور اس کے علاوہ ہر درود، دعا اور وظیفہ باطل ہے۔ قرآن و سنت میں نماز کی ادائیگی کا طریقہ تو متعین فرما دیا گیا ہے۔ لہذا اگر اس سے انحراف کر کے نماز پڑھی جائے گی تو قبول نہیں ہوگی، البتہ درود اور وظائف پڑھنے کا طریقہ یا کلمات متعین نہیں ہیں، لہذا ایسا درود اور وظیفہ جائز ہے جو کلماتِ خیر پر مشتمل ہو اس میں کوئی کلمہ خلافِ شرع نہ ہو۔ اگر کسی دعاء اور درود کے کلمات شرعاً جائز ہیں تو اس سے قطع نظر کہ وہ سندِ صحیح کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں یا نہیں، پڑھنا جائز ہیں اور ثواب کا باعث ہیں۔ ہاں اگر کسی کا عقیدہ یہ ہے کہ صرف ان خاص کلمات کے ساتھ درود اور دعا پڑھنا جائز ہے اس سے ہٹ کر کسی اور طریقے سے پڑھنا ناجائز، تو یہ عقیدہ درست نہیں ہوگا۔ مہمل تو بے معنی لفظ کو کہتے ہیں اور ”گنج العرش“ تو بامعنی نام ہے اور اس طرح کا نام رکھنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔

دروود تاج رسول اللہ ﷺ کے فضائل و کمالات اور محاسن پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی شرکیہ کلمہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی شخص العیاذ باللہ: ان کلمات کو شرک سے تعبیر کرتا ہو کہ ”دَافِعُ الْبَلَاءِ وَالْوَبَاءِ وَالْقَحْطِ وَالْمَرَضِ وَالْأَلَمِ“، یعنی حضور ﷺ ہر بلاء و مصیبت، ہر وبا، قحط، مرض اور رنج و الم کو دور کرنے والے ہیں، مومن کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ان بلاؤں، وباؤں، امراض، قحط اور ہر رنج و الم کے ازالے کے لئے وسیلہ ہیں، آپ کی برکت سے یہ مصائب دفع ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان سے نجات عطا فرماتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے روزمرہ زندگی میں ہم کہتے ہیں مجھے فلاں بیماری سے اس دواء نے شفاء دی، فلاں ڈاکٹر کے ہاتھ میں بڑی شفاء ہے، یا فلاں چیز نے مجھے بیمار کر دیا، اس طرح کے کلمات استعمال کرنے والے کو نہ کوئی مشرک کہتا ہے اور نہ سمجھتا ہے، کیونکہ اس کا مسلمان ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وہ دعایا طبیب کو بالذات شافی نہیں جانتا، بلکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شفاء دینے والا ہے اور دعایا طبیب وسیلۂ شفاء ہیں۔

قرآن پاک میں ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِنْ رَّبِّکُمْ جِ اِنِّیْ اَخْلَقْتُ لَکُمْ مِنَ الطَّیْنِ کَهَیئَةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًا مِّمَّا یَاْذُنُ اللّٰہُ جِ وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ جِ وَ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدْخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ۔ ﴿آل عمران: ۴۹﴾

”میں تمہارے پاس ایک نشانی لے کر آیا ہوں تمہارے رب کی طرف سے، کہ میں تمہارے لئے مٹی سے پرندے جیسی صورت بناتا ہوں، پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اڑتا ہوا پرندہ بن جاتی ہے اللہ کے حکم سے، اور میں شفا یاب کرتا ہوں مادرزاد اندھے اور برص والے کو، اور میں زندہ کرتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے اور میں تمہیں خبر دیتا ہوں اس چیز کی جو تم کھاتے ہو اور جو اپنے گھروں میں جمع کرتے ہو۔“

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام خلق (پیدا کرنے)، نفخ (پھونک مارنے)، شفاء دینے، زندہ کرنے اور غیب کی خبریں دینے کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتے ہیں کہ میں اللہ کے حکم سے یہ سب کام انجام دیتا ہوں، جو دراصل مخلوق کے نہیں بلکہ خالق کے کام ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے ذاتی کمال سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اذن، حکم اور عطا سے یہ سارے کام کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ رکھنا کہ کوئی اپنی ذاتی قدرت سے بلاؤں، آفات، بیماریوں اور آلام کو دفع کرتا ہے تو یہ شرک ہے، اور اگر عقیدہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی عطا سے ایسا کرتے ہیں تو یہ عین توحید ہے اور یہ قرآن پاک کے خلاف نہیں بلکہ قرآن کے مطابق ہے، اور ہم بھی درود تاج میں مذکورہ بالا کلمات اسی عقیدے سے پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ قضاء حاجات اور دفع مشکلات کا وسیلہ ہیں اور یہ عقیدہ توحید کے منافی نہیں ہے۔ باقی ہر درود اور دعاء کے لئے سند صحیح سے ثابت ہونا شرعاً ضروری نہیں ہے۔ ورنہ دنیا بھر کے لوگوں کا اپنی اپنی زبان میں اللہ تعالیٰ کی ثناء کرنا، نبی پر درود بھیجنا اللہ سے دعائیں مانگنا خلاف شرع قرار پائے گا۔

جنات نظر کیوں نہیں آتے؟

سوال:

انسانوں کو آگ نظر آتی ہے تو جنات کیوں نظر نہیں آتے ہیں، حالانکہ وہ آگ ہی سے پیدا کئے گئے ہیں؟

﴿سید محمد فرحان زیدی..... نیول کالونی، کراچی﴾

جواب:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَخَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۖ ﴿١٥﴾ الرحمن

”اور اس نے جن کو خالص آگ کے شعلے سے پیدا کیا۔“

شیاطین بھی جنات ہی کی نوع سے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَسَجِدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ ط كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ ط ﴿الكهف : ٥٠﴾

”ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سجدہ کیا، وہ جّناّت میں سے تھا اور اس نے اپنے رب کی حکم عدولی کی۔“

دوسرے مقام پر شیاطین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

إِنَّهُ يَرَاكُمْ هُوَ وَقَبِيلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط ﴿الاعراف : ٢٧﴾

”بلاشبہ وہ (شیطان) اور اس کا کنبہ تمہیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انہیں نہیں دیکھ پاتے۔“

ہمیں نظر نہ آنے کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ جس آگ سے انہیں بنایا ہے، ہو سکتا ہے وہ اتنی لطیف ہو کہ نظر نہ آ سکتی ہو، کیونکہ شیطان نے اپنے اس مادہ تخلیق کی لطافت کی بنا پر اپنے آپ کو انسان سے افضل قرار دیا ہے:

قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ ط قَالَ أَنَا خَيْرٌ مِنْهُ ج خَلَقْتَنِي مِنْ نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِنْ طِينٍ ٥ ﴿الاعراف : ١٢﴾

”(اللہ نے) فرمایا: تجھے (آدم کو) سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا، جبکہ میں نے تمہیں حکم دیا تھا؟ بولا، میں اس سے بہتر ہوں، (اے اللہ!) تو نے مجھے آگ سے تخلیق کیا ہے اور اسے مٹی سے بنایا ہے۔“

یعنی اس نے آگ کی لطافت کو مٹی کی کثافت پر فضیلت کا سبب قرار دیا۔ اور ہمیں تو بہت سی خاکی مخلوق بھی، انتہائی چھوٹے جراثیم (Virus)، خوردبین کے بغیر نظر نہیں آتے، لہذا جنات بھی لطیف ناری مخلوق ہوتے ہوئے ہمیں نظر نہ آئیں تو یہ حیرت و استعجاب کی بات نہیں ہے۔ واللہ اعلم

گمراہ پیر

سوال:

ایک شخص بظاہر تبلیغ دین کا کام بھی کرتا ہے، لوگوں کو مرید بھی بناتا ہے یعنی بیعت و ارشاد کا کام بھی کرتا ہے۔ اور تعلیٰ کے طور پر کہتا ہے کہ میں فلاں بزرگ کو مزار سے نکال کر پھینک دوں گا اور اس پر اپنا قبضہ کر لوں گا، ساتھ ہی مدرسہ تعلیم القرآن، جس میں محلے کے ۹۰ طلبہ و طالبات قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اپنے ذاتی مفادات کے لئے بند کر دیا۔ بتائیے از روئے قرآن و سنت ایسے شخص کا کیا حکم ہے؟ ﴿محمد اقبال نقشبندی مجددی ملنگی..... سیکٹر E-5، نیوکراچی﴾

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے جنازہ، میت اور قبر کی تکریم و احترام کا حکم دیا ہے، صحیح مسلم میں روایت ہے، آپ نے فرمایا: ”قبر کے اوپر نہ بیٹھو

اور قبر کی طرف رخ کر کے نماز نہ پڑھو، یعنی ایسا نظر آئے کہ قبر کو سجدہ کیا جا رہا ہے۔ اس حدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ شرعاً قبر کی اہانت و تحقیر بھی جائز نہیں اور حد شرع سے بڑھ کر تکریم بھی جائز نہیں ہے۔ صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تم میں سے کوئی شخص آگ کی چنگاری پر بیٹھے کہ اس سے اس کے کپڑے جل جائیں اور آگ کا اثر اس کی جلد تک پہنچ جائے، (اس اذیت کا برداشت کرنا) اس سے بہتر ہے کہ وہ قبر پر بیٹھ جائے (اور اس کا وبال اور گناہ اس کے ذمے آئے)۔“ بخاری و مسلم کی ایک اور حدیث میں ہے: ”حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ ایک جنازے کا ہمارے پاس سے گزر ہوا، رسول اللہ ﷺ (جنازے کو دیکھ کر) کھڑے ہو گئے، ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ کھڑے ہو گئے، ہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! (ﷺ) یہ تو ایک یہودی عورت کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا: موت ایک ہولناک چیز ہے، پس جب تم جنازہ دیکھو تو (موت کی ہولناکی کا تصور کر کے) کھڑے ہو جایا کرو۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں میت، جنازے اور قبر کی تکریم اور ان چیزوں کو دیکھ کر آخرت کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قبر پر بیٹھنے کی رسول اللہ ﷺ نے شدت سے ممانعت فرمائی ہے اور اس کی سنیابی کو آگ میں جلنے سے زیادہ شدید بتایا ہے۔ تو قبر کا کھودنا اور میت کو قبر سے نکالنا تو قبر کے اوپر بیٹھنے سے بدرجہا زیادہ بڑا گناہ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک ایسا شخص جو دین کی تبلیغ اور بیعت و ارشاد کا کام کرتا ہے، وہ دین کی بنیادی تعلیمات سے اس قدر ناواقف ہے۔ اسی لئے امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے جاہل کے تبلیغ کرنے کو حرام قرار دیا ہے۔ اور اگر وہ مسئلہ جانتے ہوئے اور حکم شرعی کو رد کرتے ہوئے ایسا کہتے ہیں، تو یہ فسق ہے اور انہیں توبہ کرنی چاہئے۔ اگر وہ قبر کسی ولی اللہ کی ہے اور وہ شخص ان کے مقام سے واقف ہے اور ان سے عناد رکھتے ہوئے ایسا کہتا ہے تو حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ”جو شخص میرے کسی ولی سے عداوت رکھے گا، میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔“ ویسے کسی شخص کی ملکیتی زمین میں اس کی اجازت اور مرضی کے بغیر کسی میت کو دفن کر دیا گیا ہو تو وہ میت کے ورثاء سے مطالبہ کر سکتا ہے کہ میت کو اس کی ملکیتی یا غصب شدہ زمین سے نکال کر دوسری جگہ دفن کیا جائے۔

سوال کے دوسرے حصے میں بتایا گیا ہے کہ مذکورہ پیر صاحب نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ”مدرسہ تعلیم القرآن“ بند کر دیا ہے، یہ سوال مبہم ہے اور ذاتی مفاد کی وضاحت سوال میں نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ مذکورہ مدرسہ اس پیر صاحب کے ذاتی مکان یا ذاتی ملکیتی جگہ پر چل رہا تھا، تو اگرچہ یہ سعادت اور خیر سے محرومی کی بات ہے، لیکن شرعاً انہیں ایسا کرنے کا حق حاصل ہے، بشرطیکہ انہوں نے ابتداء سے وقف نہ کیا ہو بلکہ عاریتاً مدرسہ تعلیم القرآن کے لئے دیا ہو۔ اور اگر وہ مدرسہ کسی ایسی جگہ چل رہا تھا جو مدرسہ ہی کے مقاصد کے لئے وقف تھی یا اس کے اصل مالک نے برضا و رغبت اس کی اجازت دے رکھی تھی تو پیر صاحب کو اس کے بند کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ قرآن مجید نے ”سورة القلم“ کی ابتدائی آیات میں دشمنانِ رسول کے جو اوصاف و ذیلہ بیان فرمائے ہیں، ان میں ایک ”مَنَاعٍ لِّلْخَيْرِ“ یعنی ”خیر کے کاموں میں رکاوٹیں ڈالنے والا“ بھی ہے۔ الغرض اگر سوال میں درج کردہ واقعات و الزامات حقیقت ہیں، محض

بہتان طرازی نہیں ہے تو ایسا شخص منصب تبلیغ، بیعت و ارشاد اور دینی رہنمائی کا اہل نہیں ہے، حق واضح ہونے پر انہیں اپنے طرزِ عمل سے رجوع کر کے توبہ کرنی چاہئے۔

محاورہ کلمہ ء کفر ہے؟

سوال:

یہ جملہ کفر کیوں ہے؟ (میری آنتیں قل هو اللہ پڑھ رہی ہیں) ﴿عرفان اللہ قادری..... کراچی﴾

جواب:

”میری آنتیں قل هو اللہ پڑھ رہی ہیں“ یہ اردو زبان کا محاورہ ہے اور یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی شخص کا معدہ خالی ہو اور بھوک کی شدت اسے ستا رہی ہو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے علامہ اقبال کا یہ شعر ہے ۔

پروانے کو چراغ بلبل کو پھول بس
صدیق کے لئے ہے خدا کا رسول بس

ظاہر ہے کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنا سارا مال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا تھا اور ان کے گھر میں باقی کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سوائے اللہ جلّ جلالہ اور اس کے حبیب ﷺ کی برکات اور مقدس نام کے۔ مذکورہ بالا محاورے میں بظاہر کوئی موجب کفر بات نہیں ہے اور نہ ہی یہ کلمہ کفر ہے۔ ہاں البتہ شرعی احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ اور اس کے حبیب کریم ﷺ کے اسماء گرامی کو روزمرہ محاورات میں اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ہمیشہ تقدس و تعظیم کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کا نام لینا چاہئے۔ ”قل هو اللہ“ قرآنی کلمات ہیں اور اعضاء کا حسب حال اللہ کی تسبیح بیان کرنا عقلاً کوئی بعید بات نہیں۔ ارشادِ بانی ہے:

وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُوْا تَسْبِيحَهُمْ ﴿٤٤﴾ ﴿الاسراء: ٤٤﴾

”اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔“

صوفیائے نقشبندیہ کے ہاں اعضاء انسانی کے ذکر کا تصور موجود ہے جسے ذکر خفی کہتے ہیں۔

میں نے اس سوال کا جواب اپنی فہم کے مطابق دے دیا تھا۔ بعد میں علامہ احمد سعید کاظمی قدس سرہ العزیز کی ایک تحریر نظر سے

گزری، جو بظاہر میرے جواب کی مؤید ہے، وہ درج ذیل ہے:

”جلوہ ہائے حقیقت محمدیہ کے ناپاک اور خبیث چیزوں میں پائے جانے کی وجہ سے اگر آپ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں

حضور کی توہین ہے تو ذرا اس امر پر غور فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں پندرہویں پارے میں ارشاد فرماتا ہے: **وان من شئی الا یسبح بحمده ولكن لا تفقهون تسبیحهم**۔ اور تسبیح کے کے متعلق علمائے اعلام و مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ تسبیح حقیقی ہے جیسا کہ مفردات امام راغب مطبوعہ ص: 220 پر مرقوم ہے۔ **فذلك یقتضی ان یکون تسبیحا علی الحقیقة** یعنی دلائل و قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ آیہ کریمہ میں تسبیح حقیقت پر محمول ہو یعنی تسبیح قولی مراد لی جائے اور صرف امام راغب ہی نہیں بلکہ علامہ آلوسی علیہ الرحمۃ تفسیر روح المعانی پارہ 15، ص: 79 پر تسبیح قولی حقیقی پر احادیث و آثار کثیرہ نقل فرما کر لکھتے ہیں: **الی مالا یکاد ویحصی من الاخبار والاثار وہی بمجموعها متعارضة فی الدلالة علی ان التسبیح قال کمالا یخفی وهو مذهب الصوفیة**۔ یعنی بے شمار احادیث اور آثار مجموعی قوت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ جس تسبیح کا ذکر فرما رہا ہے وہ ”تسبیح قالی“ ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور یہی صوفیہ کا مذہب ہے، اس کے بعد ص: 80 پر فرماتے ہیں:

ولعل الا ولی فیہ ان یلتزم حمل التسبیح علی ما هو الا عم من الحالی والقالی ویشث کلا النوعین لكل شئی۔

یعنی اولیٰ یہ ہے کہ یہاں تسبیح سے عام تسبیح مراد لی جائے جو حالی اور قالی دونوں کو شامل ہو اور دونوں قسم کی تسبیح ہر شے کے لئے ثابت کی جائے۔ ان عبارات سے یہ بات روز روشن کی ثابت ہے کہ عالم کا ہر ذرہ (خواہ پاک ہو یا ناپاک، خبیث ہو یا طیب) حالی اور قالی تسبیح حقیقی میں مصروف ہے اب صرف اتنی بات غور طلب ہے کہ یہ تسبیح ناپاک اور خبیث چیزوں میں پائے جانے کی وجہ سے کہیں ناپاک تو نہیں ہوگئی، اگر تسبیح خداوندی ہر ناپاک اور خبیث چیز میں پائی جاسکتی ہے، تو جلوہ ہائے حقیقت محمدیہ کا پایا جانا کیوں قابل اعتراض ہے، نجاست جس قسم کی ہوتی ہے اسی قسم کی اشیاء میں اثر کرتی ہے، دیکھئے مشرکین نجس ہیں، لیکن اگر کوئی مشرک اپنا صاف ستھرا ہاتھ پاک پانی میں ڈال دے تو وہ پانی ناپاک نہ ہوگا، حالانکہ شرک ناپاک ہے۔ اس پانی کے ناپاک نہ ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ پانی اس عالم اجسام کی قسم سے ہے اور مشرک کی نجاست محض اعتقادی ہے، امور اعتقادیہ عالم اجسام کی قسم سے نہیں، لہذا یہ نجاست پانی میں اثر نہیں کر سکتی، بخلاف جسمانی نجاست کے کہ وہ اشیاء جسمانیہ کو متاثر کرے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی حقیقت عالم امر بلکہ اس سے بھی بالاتر ہے اور یہ نجاست و خباثت کے آثار و صورت جسمانیہ سے متعلق ہیں جو عالم خلق کی چیز ہے۔ اب بتائیے کہ شرک کی اعتقادی نجاست پانی کو ناپاک نہیں کر سکتی تو یہ نجاستیں حضور کے نور کو کس طرح ناپاک کر سکتی ہیں؟ آفتاب و ماہتاب، شعاع بصری اور چراغ کی روشنی رات دن نجس اور ناپاک چیزوں پر پڑتی ہے مگر ناپاک نہیں ہوتی، آپ اندازہ کیجئے کہ جو نجاست مذکورہ روشنی اور اس کی شعاعوں کو ناپاک نہیں کر سکتی، وہ حضور ﷺ کے نورانی جلوؤں کو کیونکر ناپاک کر سکے گی؟، جس طرح یہ نجاست اپنی ہی نوع کی چیزوں کو متاثر کر سکتی ہے، اسی طرح اس کا ازالہ بھی ایسی ہم جنس اشیاء سے ہو سکتا ہے۔

اعتقادی نجاست پانی سے دور نہیں ہو سکتی، خواہ تمام دنیا کے سمندر مشرک کو پاک کرنے کے لئے صرف کر دیئے جائیں، لیکن وہ

پاک نہ ہوگا، اس کی پاکی کلمہ طیبہ کی تصدیق پر موقوف ہے، اگر وہ سچے دل سے ایک مرتبہ کلمہ طیبہ ”لا الہ الا اللہ“ پڑھ لے، تو جو نجاست دنیا کے پانیوں سے دور نہیں ہو سکتی وہ ایک آن میں زائل ہو سکتی ہے۔ اب اگر کوئی بے وقوف اس کلمہ طیبہ کو جسمانی نجاست کے ازالہ کے لئے استعمال کرے اور ناپاک جسم یا نجس کپڑے پر کلمہ شریف پڑھ کر پھونکنا شروع کر دے اور یہ خیال کرے کہ یہ کلمہ تو ایسا ہے کہ سات سمندروں سے جو چیز پاک نہ ہو سکے وہ اس سے پاک ہو جاتی ہے، یہ

ماشہ بھر نجاست اس کے سامنے کیا حقیقت رکھ سکتی ہے، تو کیا اس بے وقوف کا خیال صحیح ہوگا؟ یقیناً نہیں اس جسمانی نجاست کے لئے بہر صورت اسے پانی ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ جو اس عالم اجسام کی چیز ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم شہادت کی نجاستیں اسی عالم شہادت کی اشیاء کو متاثر کر سکتی ہیں اور جو نجاستیں جسمانی سے الگ ہیں، ان کا اثر جسمانیات پر نہیں ہو سکتا۔ پاکی اور ناپاکی کے اس فلسفے کو ذہن میں رکھ کر اگر آپ حاضر و ناظر کے مسئلہ کو سوچیں تو کوئی الجھن آپ کے ذہن میں باقی نہ رہے۔ آگے چل کر انہوں نے لکھا: ”خلاصہ کلام یہ ہے کہ دنیا کی ناپاک اور خبیث چیزیں ہوں، جہنم کے طبقات ہوں یا کفار و مشرکین کی ذوات، اس بات کو ماننا پڑے گا کہ ان سب چیزوں میں خدا کی شانِ جلال و کمال اور اس کی صفت و قدرت کے کمال کے وہ نمونے پائے جاتے ہیں جو کھلی ہوئی آیات اور روشن نشانیاں ہیں، جب ان خباثت و نجاست کے اثرات جلوہ ہائے جلال و جمالِ خداوندی پر اثر انداز نہیں ہو سکتے، تو حقیقت محمدیہ کے جلوے بھی تو جمالِ خداوندی ہی کے جلوے ہیں، ان کو یہ چیزیں کیسے متاثر کر سکتی ہیں؟ ﴿مقالات کاظمی، جلد: 3، ص 126 تا 128﴾

اس کے بعد علامہ غلام رسول سعیدی کی مندرجہ ذیل تحریر نظر سے گزری، وہ لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ کو بندروں اور خزیروں کا خالق کہنا ممنوع ہے: الزمر: 62-61 میں فرمایا: اور اللہ متقین کو ان کی کامیابی کے سبب سے عذاب سے نجات دے گا، ان کوئی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ ہی غمگین ہوں گے، اللہ ہر چیز کا خالق اور ہر چیز کا نگہبان ہے۔“ اس آیت سے پہلی آیت میں مشرکین مکہ بنین کی وعید کا ذکر تھا اور اس آیت میں مؤمنین اور مُصدِّقین کے وعدہ کا ذکر ہے، اس میں ان کے لئے بشارت ہے کہ نہ ان کو کوئی تکلیف پہنچے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی آفات سے محفوظ رہیں گے۔ الزمر 62 میں فرمایا: ”اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔“

اللہ تعالیٰ کی حمد میں یہ کہنا صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ گندگی، کیڑے مکوڑوں اور بندروں اور خزیروں کا خالق ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف حسن اور اچھائی کی تخلیق کی نسبت کرنا صحیح ہے اور برائی کی تخلیق کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف صحیح نہیں ہے۔ ہماری کتب عقائد میں اسی طرح مذکور ہے۔ علامہ سعد الدین مسعود بن عمر قناتزانی متوفی 791ھ لکھتے ہیں:

”يقال انه خالق الكل ولا يقال خالق القاذورات والقردة والحنازير۔“

یہ کہا جائے گا کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ گندگیوں، بندروں اور خنزیریوں کا خالق ہے۔“

﴿شرح قاصد، ج: 4، ص: 275، ایران، 1409ھ﴾

میرسید شریف علی بن محمد جرجانی متوفی 816ھ لکھتے ہیں:

”انما لا يطلق لفظ الشرير عليه كما لا يطلق لفظ خالق القردة والخنازير مع كونه خالقا لهما۔ اللہ تعالیٰ پر لفظ شریر کا اطلاق نہیں کیا جائے گا جس طرح اللہ تعالیٰ پر یہ اطلاق نہیں کیا جائے گا کہ وہ بندروں اور خنزیریوں کا خالق ہے، حالانکہ وہ ان کا خالق ہے۔“

﴿شرح المواقف، ج: 8، ص: 63، مطبوعہ: ایران﴾

علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی متوفی 881ھ لکھتے ہیں:

”ولا يصح ان يقال خالق القاذورات وخالق القردة والخنازير مع كونها مخلوقة له اتفاقا۔ اللہ تعالیٰ کو یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ وہ گندگیوں، بندروں اور خنزیریوں کا خالق ہے، حالانکہ بالاتفاق یہ تمام چیزیں اسی کی مخلوق ہیں۔“

﴿المسامرة شرح المسائره، ص: 127، دائرة المعارف الاسلاميه، مكران﴾

امام فخر الدین محمد بن عمر رازی متوفی 606ھ فرماتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ خالق الاجسام ہے لیکن اس کو کیڑے مکوڑوں اور بندروں کا خالق کہنا جائز نہیں ہے بلکہ اس قسم کے الفاظ سے اس کی

تذیہ واجب ہے۔“

﴿تفسیر کبیر، ج: 5، ص: 417، دار احیاء التراث العربی، بیروت 1415ھ﴾

یہ کہنا کفر ہے کہ میری آنتیں ”قل هو اللہ“ پڑھ رہی ہیں اور دیگر کفر یہ محاورے:

بعض لوگ شدید بھوک کا اظہار کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں: ”میری آنتیں قل هو اللہ پڑھ رہی ہیں“، یہ کلمہ کفر یہ ہے کیونکہ آنتوں

میں فضلہ اور براز ہوتا ہے اور یہ نجس چیز ہے اور نجس چیز کی طرف اللہ کے کلام کی نسبت کرنا کفر ہے۔ ملا علی قاری متوفی 1014ھ لکھتے ہیں:

من قال لا خیر طبع القدر بقل هو الله احد کُفِّر۔ جس نے دوسرے شخص سے کہا:

”پتیلی نے قل هو اللہ احد سے کھانا پکایا“، اس شخص کی تکفیر کی جائے گی۔ علامہ حسن بن منصور اور جندی متوفی 592ھ لکھتے

ہیں:

”جس شخص نے مذاق سے یا استہزاء سے یا تخفیف کرتے ہوئے کلمہ کفر کہا، وہ سب کے نزدیک کافر ہو جائے گا خواہ اس کا اعتقاد

اس کلمہ کفر کے برخلاف ہو۔“

﴿فتاویٰ قاضی خاں علی ہامش الہندیہ ج 3، ص: 577، البحر الرائق ج 5، ص: 120، المحيط البرہانی

بعض لوگ یہ شبہ پیش کرتے ہیں کہ ہر چیز خدا کی حمد اور تسبیح کرتی ہے، قرآن مجید میں ہے:

”وَانْ مِنْ شَىْءٍ اِلَّا يَسْبِحُ بِحَمْدِهِ“ ﴿بنی اسرائیل: 44﴾

ہر چیز اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتی ہے۔

اور ہر چیز کے عموم میں آنتیں بھی داخل ہیں، سوان کا قل ہوا اللہ پڑھنا بھی جائز ہونا چاہئے، اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز کے عموم میں تولید اور پیشاب بھی داخل ہے تو کیا ان کی طرف بھی حمد اور تسبیح کی نسبت کی جائے؟۔ اس لئے اس آیت کا معنی یہ ہے کہ ہر چیز جو طہر اور طیب ہو اور مبتذل نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح کرتی ہے، فقہاء نے ہانڈی اور دیگی کی طرف بھی قل ہوا اللہ پڑھنے کی نسبت کرنے کو کفر قرار دیا ہے، حالانکہ ہانڈی نجس ہے اور نہ نجاست کا محل ہے۔ اور آنتیں نجاست کا محل ہیں، تو ان کی طرف ”قل ہوا اللہ“ پڑھنے کی نسبت کرنا بہ طریق اولیٰ کفر ہوگا، اسی طرح یہ محاورات بھی کفریہ ہیں: فلاں نے فلاں کو صلواتیں سنائیں۔ اس میں گالم گلوچ اور فحش کلام پر صلوة کا اطلاق ہے، اسی طرح یہ محاورہ بھی کفریہ ہے: نمازیں بخشوانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے، اس میں روزوں سے بیزاری کا اظہار ہے۔

﴿تبیان القرآن، جلد: 10، ص: 288، 289﴾

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو اجمالی طور پر کہنا ہے کہ اللہ خالق کل شئی ”یعنی اللہ ہر چیز کا خالق ہے“، اس عموم میں بلاشبہ طیب و طہر اور خبیث و نجس ہر طرح کی مخلوق شامل ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر و شر ہر چیز کا خالق ہے، لیکن بطور خاص اسے ”خالق خنزیر“ کہنا فی نفسہ معنوی اعتبار سے درست ہونے کے باوجود خلاف ادب بارگاہ الوہیت جلّ و علا ہے۔ اسی طرح وان من شئیء الا یسبح بحمدہ ”یعنی ہر چیز (اپنی نوع اور حال کے مطابق) اللہ تعالیٰ کی حمد اور تسبیح بیان کر رہی ہے، (بنی اسرائیل، 44)“، یہ بھی اپنے عموم کے اعتبار سے تمام مخلوقات کی تسبیحات و اذکار کو شامل ہے، لیکن بطور خاص کہنا کہ: ”آنتیں قل ہوا اللہ پڑھ رہی ہیں“ بھی فی نفسہ معنوی طور پر درست ہونے کے باوجود آداب بارگاہ الوہیت جلّ و علا کے خلاف ہے اور کلمہ کفر ہے، لہذا میں اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کرتا ہوں اور قائل سے بھی کہتا ہوں کہ توبہ کرے اور تجدید ایمان کرے اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی دانستہ و نادانستہ تقصیرات کو معاف فرمائے۔

قرآن مجید نے ہمیں ذات باری تعالیٰ کا یہی ادب سکھایا ہے، چند آیات مبارکہ ملاحظہ ہوں:

(1) مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ۔ ﴿النساء: 79﴾

ترجمہ: تمہیں جو بھلائی پہنچتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور تمہیں جو برائی پہنچتی ہے، وہ تمہاری اپنی ذات کے سبب ہے۔ حالانکہ حقیقتاً بھلائی بھی اللہ کی طرف سے ہے اور مصیبت بھی اسی کی طرف سے ہے۔

(2) الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ وَالَّذِي هُوَ يُطْعِمُنِي وَيَسْقِينِ وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِينِ۔ ﴿الشعراء: 77، 78﴾

ترجمہ: ”(اللہ) وہ ہے، جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راہِ راست پر چلاتا ہے، اور وہی ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور وہی ہے جب میں بیمار ہوتا ہوں، تو مجھے شفا دیتا ہے۔“

درحقیقت بیماری بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شفا بھی اسی کی عطا ہے، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مرض (جو کہ نقص و عیب ہے) کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی اور شفا (جو کمال ہے) کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی۔

(3) اَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ

غَصْبًا۔ ﴿الكهف: 79﴾

ترجمہ: ”اور کشتی جو تھی، وہ مسکین بندوں کی تھی، جو سمندر میں محنت مزدوری کرتے تھے، تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار کر دوں، اور ان کے پیچھے ایک (ظالم) بادشاہ تھا، جو ہر (عمدہ) کشتی کو غصب کر لیتا تھا۔“

اسی سورت کی آیت نمبر 82 میں فرمایا:

(4) وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنْزٌ لَهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا

أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي۔

ترجمہ: ”دیوار جو تھی، وہ شہر میں دو یتیم لڑکوں کی (ملکیت) تھی اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ (دفن) تھا اور ان کا باپ (مرد) صالح تھا، تو تمہارے رب نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کی عمر کو پہنچ کر اپنا خزانہ نکال لیں، (ان کے ساتھ یہ حسن سلوک) تمہارے رب کی رحمت کے سبب سے ہے، اور میں نے (یہ سب کچھ) اپنی مرضی سے نہیں کیا۔“ حضرت خضر علیہ السلام نے مسکین مزدوروں کی کشتی کو عیب دار بنانے کی نسبت اپنی طرف کی (کیونکہ یہ ایک نقص ہے) اور دو یتیم لڑکوں کی دیوار کی تعمیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی (جو ایک خوبی ہے) حالانکہ انہوں نے خود بتا دیا کہ یہ دونوں کام انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دیئے۔

غزالیؒ، علامہ احمد سعید کاظمیؒ نور اللہ مرقدہم نے جو لکھا وہ دراصل تحقیقی انداز میں نہیں بلکہ الزامی انداز میں ہے، یعنی جو معاندین رسول اللہ ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے منکر ہیں اور طرح طرح کے موانع وارد کرتے ہیں اور تعریضات کرتے ہیں، تو اس طرح کے موانع اور تعریضات تو پھر اللہ تعالیٰ جل شانہ کے اپنے علم اور قدرت کے اعتبار سے ہر جگہ موجود ہونے پر بھی وارد ہو سکتے ہیں، تو ”فما ہم جوابکم فہو جوابنا“ یعنی تم شان الوہیت کی تنزیہ و تقدیس کے شایانِ شان جو جواب دو گے، اس کا اطلاق شانِ رسالت کی تقدیس پر بھی ہوگا۔

روزانہ ۷۸۶ مرتبہ بسم اللہ پڑھنے پر خواہش کا پورا ہونا

سوال:

آپ کا کالم شروع ہونے سے پہلے ایکسپریس اخبار میں ایک بار یہ چھپا تھا کہ کوئی سات روز تک روزانہ ۷۸۶ مرتبہ ”بسم اللہ الرحمن الرحیم“ پڑھے تو اس کی ہر خواہش پوری ہوگی، کیا یہ درست ہے؟ ایسی کوئی حدیث ہے؟ ﴿م الف ع..... کراچی﴾

جواب:

میرے ناقص علم میں حدیث کا کوئی ایسا حوالہ یا روایت نہیں ہے، نہ ہی سلف صالحین میں سے کسی ایک کا ایسا قول مجھے معلوم ہے، جو بزرگ ایسا عمل بتائیں، انہی سے اس کا اصل معلوم فرمائیے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم، اللہ تعالیٰ کے اسم ذات اور مقدس اسماء صفات پر مشتمل ہے، اسے جتنی بار بھی پڑھیں گے، اجر و ثواب ملے گا۔ مخصوص تعداد کے بارے میں کسی بزرگ کا مجرب عمل ہو تو ان سے رہنمائی حاصل کیجئے۔

کیا رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے وقت کعبہ جھکا تھا؟

جبریل امین نے ہر ستر ہزار سال بعد طلوع ہونے والا ستارہ بہتر ہزار مرتبہ دیکھا تھا اس کا حوالہ

سوال:

(۱): بعض علماء بیان کرتے ہیں کہ سرکارِ دو عالم ﷺ کی ولادت کے وقت کعبہ جھکا تھا، اس کے بارے میں یہ بات کوئی کتاب میں ہے حوالہ لکھ دیں۔ امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ کے سلام کا معروف شعر بھی ہے ۔

جن کے سجدے کو محراب کعبہ جھکی
ان بھنوں کی لطافت پہ لاکھوں سلام

(۲) حضور اکرم ﷺ نے ایک بار جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے، جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ایک ستارہ ستر ہزار سال کے بعد نکلتا تھا اس کو میں نے بہتر ہزار مرتبہ دیکھا، یہ بات بھی کون سی کتاب میں ہے حوالہ لکھیں۔

﴿محمد عارف الحق قادری..... لودھراں، پنجاب﴾

جواب:

اس کے بارے میں علامہ مفتی محمد خان قادری نے اپنی تالیف ”شرح سلام رضا“ میں حاشیہ سیرت حلبیہ کا حوالہ دیا ہے لیکن ہمیں یہ حوالہ مل نہیں سکا۔ تاہم اس سے قریب تر مفہوم کی جو روایت ملی ہے، وہ یہ ہے:

عن عبدالمطلب قال: كنت في الكعبة فرأيت الاصنام سقطت من اماكنها و خرت سجداً و سمعت صوتاً من جدار الكعبة يقول: ولد المصطفى المختار الذي تهلك بيده الكفار و يطهر من عبادة الاصنام و يامر بعبادة الملك العلام۔ ﴿انسان العيون في سيرة الامين المامون الشهير بالسيرة الحلبيه، مؤلفه على بن برهان الدين الحلبي، ج اول ص ۱۱۵-۱۱۶﴾

”عبدالمطلب بیان کرتے ہیں کہ میں کعبہ میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ بت اپنی جگہوں سے گر کر سجدہ ریز ہو گئے اور میں نے دیوار کعبہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ مصطفیٰ مختار کی ولادت ہو گئی جن کے ہاتھوں کفار کی ہلاکت ہوگی اور وہ (بیت اللہ کو) بت پرستی سے پاک کریں گے اور مالک حقیقی علام (الغیوب) کی عبادت کا حکم دیں گے۔“

اور دوسرے مقام پر ہے:

وليلة ولادته ﷺ تزلزلت الكعبة ولم تسكن ثلاثة ايام ولياليه۔ ﴿سيرة حلبیہ ۱۱۶/۱﴾

”اور ولادت مصطفیٰ ﷺ کی شب کعبہ لرز گیا اور تین دن اور تین رات وہ ساکن نہیں ہو۔“

مدارج النبوة جلد دوم صفحہ ۳۲ مصنفہ علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مترجم مفتی غلام معین الدین نعیمی میں ہے:

حضرت عبدالمطلب سے منقول ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ میں شب ولادت، کعبہ کے پاس تھا جب آدھی رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ کعبہ مقام ابراہیم کی طرف جھکا اور سجدہ کیا اور اس سے تکبیر کی آواز آئی کہ: **”اللَّهُ أَكْبَرُ اللَّهُ أَكْبَرُ رَبُّ مُحَمَّدٍ الْمُصْطَفَى الْآنَ قَدْ طَهَرْنِي رَبِّي مِنْ أَنْجَاسِ الْأَضْنَامِ وَأَرْجَاسِ الْمُشْرِكِينَ“** (ترجمہ: اللہ بلند و بالا ہے اللہ بلند و بالا ہے وہ رب ہے محمد مصطفیٰ کا، اب مجھے میرا رب بتوں کی پلیدی اور مشرکوں کی نجاست سے پاک فرمائے گا)، اور غیب سے آواز آئی رب کعبہ کی قسم، کعبہ کو برگزیدگی ملی، خبردار ہو جاؤ کعبہ کو ان کا قبلہ، ان کا مسکن ٹھہرایا۔ اور وہ بت جو کعبہ کے گرد نصب تھے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور سب سے بڑا بت جسے ہبل کہتے تھے منہ کے بل گر پڑا تھا۔ ندا آئی کہ سیدہ آمنہ سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور ابر رحمت ان پر اترا آیا ہے۔

شواہد النبوة (مصنفہ علامہ نور الدین عبد الرحمن جامی مترجم بشیر حسین ناظم) صفحہ نمبر ۵۷ پر ہے:

کعبہ میں بت سرنگوں ہو گئے

حضرت عبدالمطلب کا بیان ہے کہ میں حضور علیہ السلام کی ولادت کے وقت طواف کعبہ میں مصروف تھا۔ جب آدھی رات

گزری تو میں نے خانہ کعبہ کو مقام ابراہیم کی طرف سجدہ اور اللہ اکبر کی آوازیں بلند کرتے دیکھا اور کہتے سنا کہ اب مجھے مشرکوں کی نجاستوں اور زمانہ جہالت کی ناپاکیوں سے پاک و صاف کر دیا گیا ہے۔ پھر اس میں تمام بت جھک گئے، میں نے ہبل کی طرف دیکھا جو سب سے بڑا بت تھا تو وہ بھی اوندھے منہ ایک پتھر پر پڑا ہوا تھا اور منادی نے یہ صدا دی کہ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے محمد پیدا ہو چکے ہیں۔ اس وقت میں صفا پہاڑ پر چلا گیا، صفا پہاڑ کو میں نے پر غوغا دیکھا۔ مجھے ایسا نظر آتا تھا گویا تمام پرندے اور بادل مکہ پر سایہ کرنے آئے ہیں۔ پھر میں حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا کے گھر کی طرف آیا، دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا کہ دروازہ کھولو۔ حضرت آمنہ رضی اللہ عنہا نے کہا ابا جان! محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا: لاؤ ذرا دیکھوں تو کہنے لگیں: اجازت نہیں۔ پھر میں نے کہا: اے آمنہ رضی اللہ عنہا! اس بچے کو تین دن تک کسی کو مت دکھانا۔ یہ کہہ کر میں نے تلوار سونتی اور گھر سے باہر چلا گیا۔ میں نے ایک ایسے آدمی کو دیکھا جو تلوار سونتے ہوئے تھا اور چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھا، کہنے لگا: اے عبدالمطلب! واپس جاتا کہ ملائکہ مقربین اور تمام علمین کے رہنے والے تیرے بچے کی زیارت سے فارغ ہوں۔ اس سے میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ میں اسی حالت میں باہر آ گیا تاکہ قریش کو محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش کی خبر دوں لیکن میری زبان ایک ہفتہ تک بند ہو گئی اور میں کسی سے بات نہ کر سکا۔

یہ تمام روایات سند کے بغیر ہیں، ویسے فضائل میں ضعیف روایات بھی معتبر ہوتی ہیں۔

(۲) ستارے سے متعلق حدیث مندرجہ ذیل ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ سأل جبریل علیہ الصلوٰۃ والسلام فقال! یا جبریل کم عمرت من السنین؟ فقال یا رسول اللہ! لست اعلم غیر ان فی الحجاب الرابع نجما یطلع فی کل سبعین الف مرة، رأیته اثنین و سبعین الف مرة فقال یا جبریل وعزة ربی جل جلالہ أنا ذالک الکوکب۔ ﴿سیرت حلبیہ، جلد اول صفحہ ۴۹﴾

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبریل علیہ السلام سے پوچھا اے جبریل! آپ کی عمر کتنی ہے؟ جبریل علیہ السلام نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ ”حجاب رابع“ میں ایک ستارہ ستر ہزار سال میں ایک مرتبہ طلوع ہوتا ہے اور میں اسے بہتر ہزار مرتبہ دیکھ چکا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا اے جبریل! میرے رب کی عزت و جلال کی قسم، وہ ستارہ میں ہی ہوں۔“

اسی روایت کو علامہ اسماعیل حقی نے اپنی تفسیر روح البیان میں سورہ توبہ کی آیات ۱۲۹-۱۲۸ کی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

﴿روح البیان، ج ۳، ص ۶۸۹، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی، بیروت﴾

سند دونوں جگہ مذکور نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق، ایک دلچسپ عقلی سوال

سوال:

اللہ تعالیٰ نے اب تک کروڑوں اور اربوں انسان پیدا کئے ہیں تو اس سلسلے میں (یعنی انسان کی پیدائش میں) اللہ تعالیٰ کا Criteria کیا ہے، مطلب یہ کہ فلاں انسان اس دور میں پیدا ہوں گے اور فلاں اس دور میں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس دور میں پیدا ہونے کے بجائے ۵۰۰ سال پہلے یا اس سے بھی پہلے پیدا ہوا ہوتا تو مجھے ہر لحاظ سے فائدہ ہوتا۔ اچھا ماحول، اچھے لوگ، اچھی چیزیں اور اچھی صحبت میسر آتی۔ اس دور میں تو بڑے بڑے بزرگ اور ولی اللہ تھے، آج کتنے نظر آتے ہیں؟ تو بس سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو جو مختلف ادوار میں پیدا فرماتا ہے اس کی منطق (Logic) یا حکمت کیا ہے؟ ﴿عبداللہ..... دستگیر کالونی، کراچی﴾

جواب:

آپ کا سوال عقلی ہے، نہایت دلچسپ بھی اور گہرے غور و فکر کا بھی متقاضی ہے۔ اگرچہ اس کالم میں زیادہ تفصیل کی گنجائش تو نہیں ہے، لیکن اس حد تک وضاحت ناگزیر ہے کہ مسئلہ بہ آسانی ذہن نشین ہو جائے اور اشکال رفع ہو جائے۔ بنیادی طور پر یہ قضا و قدر کا مسئلہ ہے اور اس مسئلے میں زیادہ بحث و تمحیص کو شریعت نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔ سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ قادرِ مطلق اور مالک و مختار ہے اور وہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے آگے مسئول اور جوابدہ نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ ﴿٢٣﴾ الانبیاء: ٢٣ ﴿﴾

”اللہ سے نہیں پوچھا جاسکتا ان کاموں کے متعلق جو کرتا ہے اور ان سب سے باز پرس کی جائے گی۔“

لہذا کون سا کام کب کیا جائے؟ کس کی تخلیق پہلے ہو اور کس کی بعد میں؟ یہ باری تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے، مخلوق میں سے کوئی یہ سوال کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ ایسا سوال ایک نامعقول جسارت اور مقامِ بندگی سے برتر معاملہ ہے اور اس سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔ اس کے افعال مبارکہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آ جائے تو اس توفیق خیر اور سعادتِ وہبی پر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور اگر مشیت باری تعالیٰ کا کوئی فعل ہماری سمجھ سے بالاتر ہو، ماورائے عقل ہو، اس کی حکمت و حقیقت تک ہماری ناقص و ناتمام عقل کی رسائی نہ ہو سکے، تو اس کے حق و صواب ہونے پر ایمان کامل رکھتے ہوئے معاملہ اللہ کی طرف تفویض کر دینا چاہئے، اسی لئے علماء ربانین نے تقدیر کو ”سِرِّ الہی“ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے جو ضروری نہیں کہ ہم پر منکشف ہو جائے۔ اسلام، تسلیم و رضا اور مکمل خود سپردگی کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) اِنْ مَا تَكُونُوا يُدْرِكُكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشِيدَةٍ ط وَاِنْ تُصِبُّهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ج

وَاِنْ تُصِبُّهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَذِهِ مِنْ عِنْدِكَ ط قُلْ كُلُّ مَنْ عِنْدَ اللَّهِ ط ﴿النساء: ۷۸﴾

”تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو پالے گی، خواہ تم مضبوط قلعوں میں ہو، اور اگر انہیں کچھ بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ (تو) اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر انہیں کچھ برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ (اے رسول) یہ آپ کی طرف سے ہے، آپ فرما دیجئے کہ (خیر ہو یا شر، نفع ہو یا ضرر) سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔“

(۲) نَحْنُ قَدَرْنَا بَيْنَكُمْ الْمَوْتَ۔ ﴿الواقعه: ۶۰﴾

”ہم نے ہی تمہارے درمیان موت کو مقدر فرمایا۔“

(۳) وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثَىٰ وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهِ ط وَمَا يَعْمُرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنْقِصُ مِنْ عُمُرٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ط

”اللہ ہی کے علم سے ہر ماں حاملہ ہوتی ہے اور وہ (بچہ) جنتی ہے اور جس معمر شخص کو (بھی) عمر (طویل) دی جاتی ہے یا کسی کی عمر کم کی جاتی ہے، وہ سب کچھ، لوح محفوظ میں (مرقوم) ہے۔“

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام ایسے تو نبی امور مثلاً کون کب پیدا کیا جائے، کس کی عمر کتنی ہو، کوئی مرد ہو یا عورت، کوئی حسین و جمیل ہو یا بد صورت، کوئی دانا ہو یا نادان وغیرہ، جن میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے، ان پر جزا اور سزا کا مدار نہیں ہے۔ اسی طرح کسی غیر اختیاری امر پر نہ کسی پر اللہ کے غضب کا نزول ہوتا ہے اور نہ ہی اس بنا پر وہ جزاء کا حقدار ہوتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ط ﴿النساء: ۷۹﴾

”(اے مخاطب!) تجھے جو بھلائی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی ذات کے سبب ہے۔“

اللہ تعالیٰ یہود کی سرکشی کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

فَبِمَا نَفْسُہُمْ مِّثَاقُہُمْ وَكُفْرِہُمْ بَايَتِ اللّٰهِ وَقَتْلِہُمْ الْاَنْبِيَآءَ مَ بَعِيْرَ حَقٍّ وَقَوْلِہُمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْہَا بِكُفْرِہُمْ

فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ ﴿النساء: ۱۵۵﴾

”پھر ہم نے ان کی عہد شکنی کے باعث (ان پر لعنت کی) اور آیاتِ الہی کے انکار، ان کے انبیاء کو ناحق قتل کرنے، اور (سرکشی کی بناء پر) یہ کہنے کے سبب کہ ہمارے دلوں پر پردے (چڑھے ہوئے) ہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان کے کفر کے سبب (سزا کے طور پر) ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور (اب ان میں سے) بہت کم ایمان لائیں گے۔“

یہ سزا جسے قرآن مجید نے جا بجا ختم، طبع، غلاف، اکرئہ اور اس جیسے دیگر کلمات کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ مفسرین کرام نے بتایا ہے

کہ یہ کوئی حسی یا حقیقی مہر، غلاف یا پردہ نہیں ہے جس کی وجہ سے ان کے قلوب و اذہان میں نورِ ایمانی اور ہدایت کے داخل ہونے کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں، بلکہ قبولِ خیر سے ان کے صریح انکار، عناد، ضد اور ہٹ دھرمی کو علامتی طور پر ان کلمات سے تعبیر کیا ہے، اور اب وہ محض مجبور ہو گئے ہیں یا ان سے مراد ایسی علامات ہیں جن سے فرشتے ان کو پہچان لیں گے، جیسے دنیا میں بھی قیدیوں کے مخصوص لباس ہوتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت میں میری امت کی امتیازی پہچان یہ ہوگی کہ وہ مُحَجَّلُ (پنج کلیان) ہوں گے، یعنی ان کے اعضاء وضو چمک رہے ہوں گے اور نورانی ہوں گے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَى نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ ﴿الحديد: ۱۲﴾

”(اے محبوب!) جس دن آپ مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کی دائیں جانب دوڑتا ہوا

ہوگا۔“

اور اس کے برعکس کفار، منکرینِ آخرت اور فساق و فجار کی کیفیت کو قرآن نے یوں بیان فرمایا ہے:

كَأَلَّا بِلْ سَكَّ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ ﴿المطففين: ۱۴﴾

”ہرگز نہیں بلکہ ان کے اعمال (بد) کے سبب ان کے دل زنگ آلود ہو چکے ہیں۔“

اب رہا یہ سوال کہ سعادت و شقاوت، خیر و شر جب سب کچھ پہلے ہی سے تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے تو اس میں بندے کا کیا قصور؟۔ تو جواباً گزارش ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ازل سے معلوم تھا کہ کون کیا کرے گا؟ نیک ہوگا یا بد، سعادت مند ہوگا یا شقی و بد نصیب؟۔ الغرض اپنے علم حق کے مطابق اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے، یعنی یہ نہیں کہ چونکہ تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے اس لئے اس نے لازماً ایسا ہی کرنا ہے، بلکہ جو کچھ اس نے آگے چل کر کرنا تھا وہ لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک آرکیٹیکٹ اور انجینئر کسی پل یا ڈیم کا ڈیزائن بناتا ہے، اس کے تعمیراتی سامان کا ایک معیار مقرر کرتا ہے، پھر مقررہ ڈیزائن اور معیار کے مطابق اسے تعمیر کیا جاتا ہے اور آرکیٹیکٹ اور انجینئر پہلے ہی یہ بتا دیتا ہے کہ یہ پل یا ڈیم اتنی مدت کے لئے کارآمد ہوگا اور پھر عملاً ایسا ہی ہوتا ہے۔ اب اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر وہ انجینئر ہزار سال تک کی پیشین گوئی کر دیتا تو وہ پل ہزار سال تک کارآمد رہتا، بلکہ اس کا تعلق اس پل یا ڈیم کے ڈیزائن یا استعداد پر ہے اور انجینئر کی پیش گوئی اس کے فنی علم و تجربے کی روشنی میں ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کے ظن و تخمین اور علم میں خطا کا احتمال ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے علم یقینی میں رائی کے دانے کے برابر بلکہ اس کے کروڑوں حصے کے برابر بھی خطا کا کوئی احتمال نہیں۔

کوئی عالم، انجینئر یا سائنسدان تو درپیش حالات و واقعات اور حقائق کے پیش نظر رائے قائم کرتا ہے لیکن وہ عالم الغیب نہیں ہے۔ مستقبل میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اسے علم نہیں ہوتا، غیر متوقع طور پر کوئی بہت بڑا سیلاب آجائے، زلزلہ آجائے، میٹریل ناقص نکل آئے،

آندھی یا طوفان آجائے، یا اچانک آگ لگ جائے وغیرہ، تو اس کے سارے کے سارے تخمینے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے اور اس کی پیش گوئی یا تخمینہ ناکام ہو جائے گا۔ جبکہ علم الہی ماضی، حال اور مستقبل، غیب و شہود، حوادث و آفات، ظاہر و پوشیدہ، کمالات و نقائص سب پر محیط ہے، لہذا اس میں کسی بھی درجے میں کسی بھی مرحلے میں از ابتداء آفرینش تا ابد کسی بھی خطا کا عقلاً یا عادتاً کوئی امکان نہیں ہے۔ یہ مسئلہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تقدیر ازل میں کسی کے بارے میں کیوں لکھ دیا کہ وہ بامراد ہوگا یا نامراد، اس کے برعکس کیوں نہیں لکھ دیا؟۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک معلم اپنے ایک شاگرد کے جملہ احوال کو جانتا ہے اور ان حقائق کے پیش نظر وہ پیش گوئی کر دیتا ہے کہ تم فیل ہو جاؤ گے اور وہ فیل ہو جاتا ہے، اس کو عام محاورے میں نوشنہ دیوار کہتے ہیں۔ کیا اگر اسے معلم کہہ دیتا کہ تم یونیورسٹی میں ٹاپ کرو گے تو ایسا ہو جاتا، ہرگز نہیں۔ مزید یہ کہ استاد کا اپنے شاگرد کی ناکامی کی پیش گوئی کرنا اس کی رضا اور تمنا نہیں ہے بلکہ قانون مکافات عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہی فرق رضاء الہی اور مشیت الہی میں ہے، کفار و مشرکین اور فساق و فجار کو نارِ جہنم کا عذاب دینا رضاء الہی نہیں بلکہ مشیت ربانی اور قانون مکافات عمل ہے۔

اب اصل مسئلہ کی طرف آتے ہیں کہ کسی کو پہلی صدی میں اور کسی کو پندرھویں صدی ہجری میں پیدا کرنے میں خالق کی حکمت کیا ہے اور کیا اس دور میں پیدا ہونے والوں کے ساتھ معاذ اللہ خالق جل شانہ نے کوئی نا انصافی تو نہیں فرمائی؟ اس کا ایک سادہ اور اٹل جواب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل مختار اور قادر مطلق ہے اور وہ اپنے کسی عمل کے لئے کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہے، لیکن اس کا کوئی عمل حکمت سے خالی بھی نہیں ہے اور اس نے اپنے کرمِ عالی اور فضل و احسان سے کسی کو محروم نہیں رکھا۔ اگر اس نے سابقین اولین کے لئے درجات رکھے ہیں تو متاخرین یا بعد میں آنے والوں کے لئے بھی حصول خیر کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ بلاشبہ قرونِ اولیٰ میں نیکیوں کی فراوانی تھی۔ ماحول سارے کا سارا ایمان افروز اور روح پرور تھا۔ ایسے ماحول میں نیک بن کر رہنا اور نیکی کرنا نسبتاً آسان تر تھا، آج صورتِ حال بالکل برعکس ہے، برائی معاشرے میں اس طرح اندر تک سرایت کئے ہوئے ہے جیسے انسان کی نسِ نس میں خون دوڑ رہا ہے۔ ایسے ماحول میں خیر کے جادہ مستقیم پر رہنا جہادِ اکبر نہیں تو اور کیا ہے۔ مگر خیر کے راستے میں رکاوٹیں جس قدر زیادہ ہیں اتنا ہی اجر و ثواب بھی زیادہ ہے۔ حدیث پاک ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّكُمْ فِي زَمَانٍ مِّنْ تَرَكَ مِنْكُمْ عَشْرَ مَا أَمَرَ بِهِ هَلَكَ ثُمَّ يَأْتِي زَمَانٌ مِّنْ عَمَلٍ

مِنْهُمْ بِعَشْرِ مَا أَمَرَ بِهِ نَجَا۔ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے (صحابہ کرام سے) فرمایا:

”تم ایک ایسے (مبارک) دور میں ہو کہ تم میں سے جو شخص احکامِ شریعت کا دسواں حصہ بھی چھوڑ دے گا ہلاک ہو جائے گا، پھر

(تمہارے بعد) ایک ایسا دور آئے گا کہ ان لوگوں میں سے جو شخص احکامِ شریعت کے دسویں حصے پر بھی عمل پیرا رہا تو نجات پالے گا۔“

رسول اللہ ﷺ سے جب دریافت کیا گیا کہ آپ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والا کون ہے؟ تو آپ نے فرمایا: ”بے شک میری امت میں سے مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرنے والے لوگ وہ ہیں جو میرے (وصال کے) بعد آئیں گے، ان میں سے ایک شخص تمنا کرے گا کہ کاش میں اپنا گھر بار اور مال و متاع سب کچھ قربان کر دوں اور (اس کے صلے میں) مجھے اللہ کے رسول کا دیدار نصیب ہو جائے۔“

صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ ﴿﴾

ایک اور حدیث میں آپ نے فرمایا: ”جب میری امت (کے عقائد، اخلاق اور معاملات) میں بگاڑ پیدا ہوگا تو اس وقت جو شخص میری سنت پر قائم رہے گا، اسے سوشہیدوں کا ثواب ملے گا۔“

بیہقی، بحوالہ مشکوٰۃ ﴿﴾

تو آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں ہمارے لئے بڑی بشارتیں، سعادتیں، اجر و ثواب اور انعام و اکرام کا خزانہ موجود ہے جو ہمارا منتظر ہے، کاش کوئی ہم میں سے اسے حاصل کرنے کے لئے پیش قدمی کرے، اس لئے اس دور پر فتن میں پیدا ہونا مایوسی کی بات نہیں ہے، بلکہ اجر و ثواب کے مواقع زیادہ ہیں۔

کسی بندے کے بارے میں کہنا ”(العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں“

سوال:

میرے کچھ سرالی جو ایک معروف شخص کے پیروکار و عقیدت مند ہیں، جن میں میرے شوہر کی سگی بہنیں بھی شامل ہیں، یہ لوگ اپنے مرشد کے بارے میں کہتے ہیں کہ: (نعوذ باللہ) ”ہمارے اللہ وہ ہیں“ ان کی ایک ساتھی کا انتقال ہوا تو ان کا کہنا تھا کہ اسے پیر صاحب نے اپنے پاس بلالیا، اس کے جنازے میں کلمے کے بجائے پیر صاحب کے نعرے لگاتے رہے۔ یہ لوگ اذان اور نماز کو نہیں مانتے اور نہ ہی قرآن شریف پڑھتے ہیں بلکہ مذاق اڑاتے ہیں۔ میری نند جو پیر صاحب کی پیروکار ہے، اس کی شادی اس جیسے خیالات رکھنے والے شخص سے ہو رہی ہے۔ جناب میں معلوم یہ کرنا چاہتی ہوں کہ:

(۱) میری ساس اور سرسرجو کہ نماز اور روزے کے پابند ہیں، اس شادی کے کرنے میں ان کے لئے کیا حکم ہے؟ کیا وہ گناہگار ہوں گے؟

(۲) کیا میرے شوہر اور میں اس شادی میں شرکت کر سکتے ہیں؟

(۳) جن والدین کی اولاد اس طرح کے خیالات رکھتی ہو ان کو اپنی اولاد کے ساتھ کیسا سلوک رکھنا چاہئے؟

(۴) اگر کسی شخص کی بیوی اس پیر صاحب کی پیروکار ہو جائے تو ان کے نکاح پر کیا اثر پڑے گا؟ کیا نکاح قائم رہے گا؟

﴿اہلیہ انور احمد، کراچی﴾

جواب:

بر تقدیر صدق سائلہ جو شخص غیر اللہ کے بارے میں کہے کہ (العیاذ باللہ) ہمارے اللہ وہ ہیں، یہ صریح کفر اور شرک ہے اور جو راہنما یا پیشوا یہ جانتا ہو کہ اسے (معاذ اللہ) اللہ کہا جا رہا ہے اور وہ اپنے پیروکار کو روکے ٹوکے نہیں تو یہ کفر و شرک پر رضامندی ہے اور یہ بھی کفر ہے۔ ایسے لوگ اگر شادی شدہ ہوں تو ان کا نکاح باطل ہو جائے گا تا وقتیکہ یہ کفر سے توبہ نہ کر لیں۔ پھر ان کی تجدید نکاح ہو سکے گی۔ جب تک یہ لوگ اپنے (سوال میں بیان کردہ) عقائد کفریہ پر قائم ہوں، ان سے ہر طرح کا میل جول، رشتہ نکاح قائم کرنا اور ان کی سماجی تقریب میں شرکت کرنا حرام ہے۔

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے: ”اور ظالموں کی طرف میلان نہ رکھو ورنہ تمہیں جہنم کی آگ چھوئے گی۔“

(۱) آپ کی ساس اور سسر اگر ان کے کفر پر مطلع ہونے کے باوجود اس پر راضی ہوں گے اور ایسے شخص کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیں گے تو یہ ”رضا علی الکفر“ کی بنا پر کفر ہے۔

(۲) آپ لوگوں کے لئے شرعاً اس شادی میں شرکت سے اجتناب لازم ہے۔

(۳) والدین کو چاہئے کہ ایسے عقائد کی حامل اولاد کو ان عقائد باطلہ کے کفر پر مطلع کر کے انہیں ان سے رجوع کی دعوت بلکہ حکم دیں، اور اگر وہ باطل سے ”رجوع الی الاسلام“ پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے قطع تعلق کر لیں، ہر مسلمان روزانہ دعائے قنوت میں اپنے رب سے یہ عہد و پیمان کرتا ہے کہ:

”وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَفْجُرُكَ“

یعنی ”اے اللہ! جو تیرا نافرمان ہے ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں۔“

(۴) اگر وہ شخص صحیح العقیدہ مسلمان ہے تو بیوی کے کفریہ عقائد اختیار کرنے سے نکاح باطل ہو جائے گا تا وقتیکہ وہ اپنے کفر پر مطلع ہونے کے بعد توبہ کر کے دوبارہ اسلام قبول کر لے۔ تجدید ایمان کے بعد تجدید نکاح بھی کرنی ہوگی۔

تخلیق ارض و سماء سے پہلے عرش کہاں تھا؟

سوال:

زمین و آسمان کی تخلیق سے پہلے عرش الہی کہاں تھا؟

﴿عبداللہ..... گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا۔

﴿ہود: ۷﴾

”اور (اللہ) وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمینوں کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ وہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کس کا عمل سب سے اچھا ہے۔“

امام ابن جریر نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ ان سے سوال کیا گیا کہ قرآن مجید میں ہے کہ عرش پانی پر تھا، تو پانی کس چیز پر تھا؟، انہوں نے کہا کہ وہ ہوا کی پشت پر تھا۔ ﴿جامع البیان، رقم الحدیث: ۱۳۹۰۵﴾
امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ لکھتے ہیں:

”اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اس کا عرش پانی پر تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی عجیب و غریب قدرت کے اظہار کے لئے یہ فرمایا ہے، کیونکہ کسی عمارت کو بنانے والا اپنی عمارت کو سخت زمین پر پانی سے دور رکھ کر بناتا ہے تاکہ اس کی عمارت منہدم نہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمینوں کو پانی پر بنایا تا کہ عقل والے اس کی قدرت کے کمال کو جان لیں۔“ ﴿تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۹۲﴾
امام رازی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

”اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت پر دلالت ہے، کیونکہ عرش تمام آسمانوں اور زمینوں سے زیادہ بڑا ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس کو پانی پر قائم کیا ہے، پس اگر اللہ تعالیٰ کسی ستون کے بغیر کسی وزنی چیز کو رکھنے پر قادر نہ ہوتا تو عرش پانی پر نہ ہوتا، اور اللہ تعالیٰ نے پانی کو بھی بغیر کسی سہارے کے قائم کیا، نیز عرش کے پانی پر ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ عرش پانی کے ساتھ ملتصق اور متصل ہے، یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ آسمان زمین کے اوپر ہے۔“ ﴿تفسیر کبیر ج ۶ ص ۳۲۰-۳۱۹﴾
علامہ سید محمود آلوسی متوفی ۱۲۷۰ھ لکھتے ہیں:

”اس میں کوئی شک نہیں کہ پانی سے مراد وہی پانی ہے جو عناصر اربعہ میں سے ایک عنصر ہے اور عرش سے مراد وہی عرش معروف ہے، اور عرش کے پانی پر ہونے کا معنی عام ہے، خواہ عرش پانی سے متصل ہو یا منفصل۔“ ﴿روح المعانی ج ۷ ص ۱۵﴾
علامہ غلام رسول سعیدی تبیان القرآن جلد پنجم صفحہ ۵۰۳ پر لکھتے ہیں:

”ہمارے نزدیک یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ پانی سے مراد یہی معروف پانی ہے یا اس سے مراد مادّے کی مائع حالت (FLUID) ہے جس پر بطور استعارہ پانی کا اطلاق کیا گیا ہے، اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ زمین و آسمان سے پہلے پانی کی تخلیق ہو چکی

تھی، اور ایک اور آیت سے یہ معلوم ہوا کہ پانی ہی اصل کائنات اور منبع حیات ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَالَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَاهُمَا مَاءً كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط أَفَلَا يُؤْمِنُونَ ۝

﴿الانبیاء: ۳۰﴾

کیا کافروں نے یہ نہیں دیکھا کہ زمین و آسمان باہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا، اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا، تو کیا وہ ایمان نہیں لاتے۔“

کافر ملت پر معلق کر کے قسم کھانا

سوال:

بعض لوگ قسم کھاتے وقت جوش میں آ کر اس طرح کے کلمات استعمال کرتے ہیں کہ: ”اگر میں نے یہ کام کیا ہو یا ایسا کام کروں تو یہودی ہو جاؤں یا عیسائی ہو جاؤں یا کافر ہو کر مروں یا ایمان سے محروم ہو جاؤں“، اور وہ قسم میں جھوٹا ہے یا قسم توڑ دی، تو کیا حکم ہے؟
﴿کھتری عصمت علی پٹیل، کراچی﴾

جواب:

جس شخص نے کسی کام کے کرنے کو ”ملت غیر اسلام“ پر معلق کیا، مثلاً کہا ”اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں“، تو اس کے تین محال ہیں:

(۱) اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ کام اسی طرح ”واجب الامتناع“ ہے (یعنی اس کا نہ کرنا ضروری ہے)، جیسے یہودی نہ ہونا ضروری ہے اس صورت میں وہ کافر نہیں ہوگا، لیکن چونکہ حدیث میں ایسی قسم کھانے سے منع فرمایا ہے، اس لئے وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا اور حدیث میں جو اس کو کافر فرمایا گیا ہے، وہ زجر و توبیخ پر مشتمل ہے۔
﴿البحر الرائق ج ۴ ص ۲۸۴ مطبوعہ مکتبہ ماجدیہ، کوئٹہ﴾

اور اگر اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ یہ کام بالکل نہیں کرے گا، اور اس نے یہ کام کیا تو اس کا یہودی ہونا صحیح، برحق اور حلال ہے تو اس صورت میں وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے ماضی کے حوالے سے کسی کام کے نہ کرنے کی جھوٹی قسم کھائی اور کہا کہ اگر اس نے یہ کام کیا ہو تو یہودی ہے، اور اس کا یہودی ہونا صحیح اور برحق ہے، تو اس صورت میں وہ فی الفور کافر ہو جائے گا، کیونکہ کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

﴿البحر الرائق ج ٤ ص ٢٨٦-٢٨٥ مطبوعه كوئٹہ، الدر المختار علی رد المحتار ج ٥ ص ٣٩٤-٣٩٢ مطبوعه دار احیاء التراث العربی بیروت ١٤١٩ھ﴾

اس سلسلے میں تیسری بات یہ ہے کہ اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت سے قسم کھائی کہ اگر میں نے فلاں کام کیا تو میں یہودی ہوں تو ایسی صورت میں بھی وہ کافر ہو جائے گا کیونکہ اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی تعظیم کرنا کفر ہے، اور اگر اس نے یہودیت کی تعظیم کی نیت نہیں کی تھی تو وہ کافر نہیں ہوگا، اور حدیث پاک میں جو ارشاد ہے، ”وہ کافر ہو جائے گا“ یہ کفرانِ نعمت پر محمول ہے۔

﴿صحیح مسلم مع شرح النووی، رقم الحدیث: ١١٠، مطبوعه مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز، مکہ مکرمہ ١٤١٧ھ﴾

حدیث مبارک، جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، یہ ہے: ”ثابت بن قیس ضحاک بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے درخت کے نیچے (یعنی بیعت رضوان، جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوئی) رسول اللہ ﷺ (کے دست اقدس پر) بیعت کی، اس موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے ”ملت غیر اسلام“ پر جھوٹی قسم کھائی (یعنی یمین غموس) تو وہ ایسا ہی ہے، جیسا اس نے کہا۔“

جنت کی حوریں کیا ہیں؟ اور نیک خواتین کے لئے کیا ہوگا؟

سوال:

قرآن مجید میں حوروں کا تذکرہ ہے، یہ بھی علماء سے سنتے رہتے ہیں کہ نیک مردوں کو جنت میں حوریں ملیں گی، تو نیک وصالح اور پاکباز خواتین کو کیا ملے گا؟
﴿صالحہ خاتون، کراچی﴾

جواب:

قرآن مجید میں چار مقامات پر صراحت کے ساتھ حوروں کا تذکرہ آیا ہے، متعلقہ آیات مبارکہ اور ان کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

(١) اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝۱۱۱ فِىْ جَنَّاتٍ وَعُيُوْنٍ ۝۱۱۲ يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاَسْتَبْرَقٍ مُّتَقَابِلِيْنَ ۝۱۱۳ كَذٰلِكَ وَقَدْ وُزِّعَتْ لَهُمْ بِحُورٍ عِيْنٍ ۝۱۱۴ ﴿الدخان: ٥١ تا ٥٤﴾

”بیشک پرہیزگار امن کی جگہ میں ہوں گے، باغات اور چشموں میں، باریک اور دبیز ریشم کا لباس پہنے آمنے سامنے (بیٹھے ہوئے) ہوں گے، ایسا ہی ہوگا اور ہم گوری کشادہ چشم عورتیں ان کی زوجیت میں دیں گے۔“

(٢) مُتَّكِئِيْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۝۱۱۵ وَزَوْجُهُمْ بِحُورٍ عِيْنٍ ۝۱۱۶ ﴿الطور: ٢٠﴾

”وہ برابر بچھے ہوئے تختوں پر تکیے لگائے (بیٹھے) ہوں گے، اور ہم انہیں زوجیت میں دیں گے گوری، کشادہ چشم عورتیں۔“

(۳) حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ الرحمن: ۷۲ ﴿﴾

”گوری کشادہ چشم بیویاں خیموں میں (باپردہ) ٹھہرائی ہوئی ہوں گی۔“

(۴) وَحُورٌ عِينٌ ۝ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ۝ الواقعة: ۲۲، ۲۳ ﴿﴾

”گوری کشادہ چشم بیویاں، جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی۔“

معتبر و مستند تفاسیر میں احادیث و روایات کے حوالے سے حوروں کے متعلق جو تشریحات آئی ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

امام طبرانی روایت کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں ”میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! قرآن مجید میں ”حور عین“ کا تذکرہ ہے، اس کی تفسیر فرمائیے! آپ نے فرمایا: وہ گورے رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی ہوں گی اور ان کی اتنی گھنی پلکیں ہوں گی، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! قرآن کی آیت ”کانھن الیاقوت والمرجان“ کی تفسیر بیان فرمائیں، آپ نے فرمایا! جیسے صدف میں موتی صاف اور شفاف ہوتا ہے، جس کو کسی نے چھوا تک نہ ہو، وہ اس طرح صاف اور غیر کے لمس اور مس سے پاک ہوں گی، (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ”کانھن بیض مکنون“ کی تفسیر بیان فرمائیے! آپ نے فرمایا: ان کی جلد اس طرح ہوگی جیسے انڈے کے چھلکے کے اندر لپٹی ہوئی جھلی باریک ہوتی ہے۔ (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! دنیا کی عورتیں، آپ نے فرمایا: دنیا کی عورتیں ”حور عین“ سے اس طرح افضل ہوں گی، جس طرح ظاہر باطن سے افضل ہوتا ہے۔ (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اس فضیلت کا سبب؟ آپ نے فرمایا: اس فضیلت کا سبب ان کے روزے اور ان کی نمازیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے چہروں میں نور پیدا فرمادے گا، ان کا جسم ریشم کی طرح ہوگا، رنگ گورا ہوگا، کپڑے سبز ہوں گے، سنہرے زیورات ہوں گے، ان کی انگوٹھی موتی کی ہوگی، ان کی کنگھیاں سونے کی ہوں گی، وہ کہیں گی: سنو! ہم دائمی ہیں، کبھی نہیں مریں گی، سنو! ہم ہمیشہ نعمت میں ہیں، کبھی مغموم نہیں ہوں گی، ہم قیام کرنے والیاں ہیں، کبھی سفر نہیں کریں گی، ہم خوش ہونے والیاں ہیں، کبھی ناراض نہیں ہوں گی، اس کو مبارک ہو جس کے لئے ہم ہیں اور وہ ہمارے لئے ہے، (فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا! ہماری بعض عورتیں دنیا میں (یکے بعد دیگرے) دو خاوندوں سے نکاح کرتی ہیں، بعض تین سے اور بعض چار سے تو ایسی عورتیں جنت میں کس خاوند کے نکاح میں ہوں گی؟ آپ نے فرمایا: ام سلمہ! اس عورت کو اختیار دیا جائے گا، اور جس خاوند کا اخلاق دنیا میں سب سے اچھا ہوگا وہ اس کو اختیار کرے گی، وہ کہے گی: اے میرے رب! اس خاوند کا اخلاق سب سے اچھا تھا، میرا اس سے نکاح کر دے، اے ام سلمہ! دنیا اور آخرت کی خیر اچھے اخلاق کے ساتھ وابستہ ہے۔“ ﴿المعجم الكبير جلد ۲۳ صفحات، ۳۸۶، ۳۸۷﴾

امام سیوطی بیان کرتے ہیں: امام احمد اور امام ترمذی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، ادنیٰ درجے کا جنتی

شخص وہ ہوگا جس کی بہتر (72) بیویاں ہوں گی، دو دنیا کی عورتیں ہوں گی اور ستر آخرت کی۔“ ﴿درمنثور: ج ۱ ص ۳۹﴾

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی صالحہ، عابدہ، زاہدہ، طیبہ و طاہرہ خواتین کو بھی اللہ تعالیٰ جنت میں شباب اور بے مثال حسن و جمال عطا فرمائے گا اور سب عالم شباب میں ہوں گی، وہ حورانِ جنت سے کم تر نہیں ہوں گی، بلکہ شاید برتر ہی ہوں گی، ایک روایت میں ہے کہ ایک بڑھیا خاتون نے حضور ﷺ سے التجا کی کہ میرے لئے جنت کی دعا فرمائیے! آپ کبھی کبھی مزاح لطیف بھی فرماتے تھے، آپ نے فرمایا: ”کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہیں جائے گی، یہ سن کر وہ عورت افسردہ ہو گئی تو اس کی تسلی خاطر کے لئے آپ نے فرمایا: ”جو خوش نصیب بھی جنت میں جائے گا، عالم شباب میں جائے گا۔“

یہ بھی ہو سکتا ہے جن صالح مردوں اور عورتوں کی دنیا میں شادی نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ جنت میں ایسے مردوں اور عورتوں کے مابین نکاح فرمادے، اگر خدا نخواستہ کوئی بیوی جنتی ہے، مگر خاوند جہنمی یا اس کے برعکس، تو ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے جنتی مردوں اور عورتوں کے درمیان نکاح کے حکم فرمادے جن کا دنیوی رفیق حیات اپنی بد اعمالیوں اور شقاوت کی وجہ سے جہنم میں جا چکا ہے، اللہ ہم سب کو ایسی صورت حال سے امان و عافیت عطا فرمائے۔

ایک مفسر مولانا مودودی نے یہ لکھا ہے کہ ممکن ہے یہی دنیا کی عورتیں، جو جنتی ہوں گی، جنت میں جا کر جمال و شباب بے مثال کی وجہ سے ”حور عین“ کی صورت میں ڈھل جائیں، لیکن جب ایسی روایات موجود ہیں جن میں جنت کی ”حور عین“ کے الگ وجود کی تصریح فرمادی گئی، تو ہمارے لیے کسی دلیل شرعی کے بغیر اس کے انکار یا گریز کا کوئی جواز نہیں ہے، جب کہ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، صادق الوعد ہے تو اس کی قدرت و کرم سے کوئی بھی چیز بعید نہیں ہے۔

ناگہانی مصیبت کا نزول؟

سوال:

اگر کسی کے گھر میں چوری یا ڈکیتی ہو جائے، یا آگ لگ جائے تو کیا یہ سمجھنا درست ہے کہ ان کا تمام مال و اسباب حرام کا تھا، یا یہ نظریہ غلط ہے؟

﴿محمد شاہد اعجاز۔ ناظم آباد، کراچی﴾

جواب:

شریعت نے کوئی ایسا قاعدہ کلیہ نہیں بتایا کہ ہمیشہ کسی واقعے کا ظہور ایک ہی سبب کی بنا پر ہوگا۔ کسی ناگہانی مصیبت یا افتاد کے نازل ہونے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں اور اس کا قطعی علم اللہ تعالیٰ ہی کی ذات کو ہوتا ہے۔ ہم صرف اپنی دستیاب معلومات کے مطابق قیاس ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں قطعی سبب کے معلوم نہ ہونے کی صورت میں حسن ظن سے کام لینا چاہئے، کسی بھی افتاد کی ممکنہ وجہ حسب ذیل ہو سکتی

ہیں:

(۱) یہ کہ انسان کو کسی غلطی، جبر یا ظلم کی سزا مل رہی ہے، کیونکہ قدرت اپنی حکمت کے تحت کبھی مہلت دیتی ہے اور کبھی جلد مواخذہ فرمالتی ہے۔

(۲) یہ کہ اس ابتلاء و آزمائش میں انسان کے لئے خیر کا پہلو پوشیدہ ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”مسلمان کو جو بھی تکلیف، دشواری، غم و اندوہ، حزن و ملال، حتیٰ کہ اسے کانٹا بھی اگر چبھ جائے تو اللہ تعالیٰ اس تکلیف کے عوض اس کے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے (بشرطیکہ جزع و فزع نہ کرے، صبر و استقامت کا مظاہرہ کرے اور تقدیر الہی پر شاکہ نہ ہو بلکہ راضی ہو)۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین﴾

(ب) حدیث قدسی میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے: ”جب میں اپنے بندے کی دو محبوب چیزیں لے کر (یعنی اس کی دونوں آنکھوں کی بینائی سلب کر کے) اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہوں اور وہ اس (مصیبت) پر صبر کرتا ہے تو میں ان کے بدلے میں اسے جنت دے دیتا ہوں۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری﴾

(ج) ”جب بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں (یعنی اس کے علم اور تقدیر میں) کوئی اعلیٰ مرتبہ پہلے سے مقدر ہو جاتا ہے، جس کا وہ اپنے عمل صالح کے ذریعے حقدار نہیں بن پاتا تو اللہ تعالیٰ اسے جان، مال یا اولاد کی کسی مصیبت میں مبتلا فرما دیتا ہے۔ پھر وہ اس (ابتلاء) پر صبر کرتا ہے، یہاں تک کہ صبر و استقامت کے ذریعے اس مقامِ عالی کا حقدار بن جاتا ہے جو اللہ کے علم میں پہلے سے اس کے لئے مقدر ہے۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داؤد﴾

(د) ”جو لوگ دنیا میں عافیت و سلامتی کی زندگی گزار چکے ہوتے ہیں، وہ جب قیامت کے دن اہل ابتلاء و آزمائش کے اجر کو دیکھیں گے تو تمنا کریں گے کہ کاش (دنیا میں) ان کی کھالیں قینچیوں سے کاٹی جاتیں۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی﴾

(۳) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو اس کی غلطی، تمرد و سرکشی یا کسبِ حرام پر متنبہ کرنا مقصود ہوتا ہے اور اس پر کوئی ناگہانی افتاد ڈال دی جاتی ہے تاکہ وہ خوابِ غفلت سے بیدار ہو اور اپنی اس (باغیانہ) روش یا دینی معاملات میں غفلت و تساہل سے باز آجائے، ایسے میں وہ افتاد یعنی جان و مال کا سلب ہو جانا، انسان کو اچھا تو نہیں لگتا لیکن انجامِ کار اس میں خیر ہوتی ہے، بشرطیکہ انسان اس ابتلاء سے سبق حاصل کر لے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ ﴿البقرة: ۲۱۶﴾

”کوئی بعید نہیں کہ تم ایک چیز کو (ظاہر حال میں) اپنے لئے برا سمجھو لیکن وہ (حقیقت حال میں) تمہارے لئے خیر ہو۔“

امید ہے اس تفصیلی جواب سے آپ کی تسلی ہو جائے گی۔

انتقال کرنے والے خواب میں نظر آتے ہیں؟

سوال:

انتقال کرنے والے خواب میں کیوں نظر آتے ہیں، میرے بعض مرحوم اقارب کھانا کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

﴿مسز عائشہ بھومبل، دردانہ۔ عزیز آباد﴾

جواب:

اس کا ایک سبب تو نفسیاتی ہے کہ انسان کے ذہن میں جو اشخاص، افکار اور خیالات بکثرت تازہ رہتے ہیں، وہ کبھی کبھی خواب میں بھی متشکل ہو کر آ جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ان سے محبت ہوتی ہے یا ان ارواح کو آپ سے محبت ہوتی ہے، کھانا کھاتے ہوئے نظر آنا کوئی تشویش کی بات نہیں ہے، بہتر ہے کہ آپ ان کے لئے دعاء مغفرت کریں اور ہو سکے تو ان کے ایصالِ ثواب کے لئے اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ و خیرات کریں، حدیث شریف میں ہے کہ اس سے عالم برزخ میں انہیں راحت ملتی ہے، اگر خدا نخواستہ کسی اذیت و عذاب کی کیفیت سے دوچار ہوں تو اللہ تعالیٰ دعاء مغفرت و ایصالِ ثواب کی برکت سے تخفیف فرماتا ہے۔

”میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں“، کیا یہ کلمہ کفر ہے؟

سوال:

”بکر نے زید سے کہا کہ آپ بادشاہ بننے والے ہیں“، تو زید نے کہا کہ: ”میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے کہ میں بادشاہ بننے والا

ہوں“، کیا یہ جملہ کلمہ کفر ہے؟ ﴿عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی﴾

جواب:

یہ کلمہ کفر نہیں ہے، کیونکہ ہر فرشتے کے بارے میں علم غیب کلی کا اعتقاد شرعاً ثابت نہیں ہے، بالعموم فرشتے انہی امور کا علم رکھتے ہیں جو انہیں تفویض کئے جاتے ہیں، جیسے قبضِ ارواح اور ہر ذی روح کی اجل (یعنی موت کا وقت اور مقام) کا علم ”ملک الموت“ (فرشتہ اجل) اور اس کے کارندوں کو ہے، قیامِ قیامت کا علم حضرت اسرافیل کو ہے، علیٰ ہذا القیاس وہ فرشتے جو بادلوں کو چلانے اور بارش برسانے پر مامور ہیں یا وہ فرشتے جو رحمِ مادر میں جنین میں روح ڈالنے پر مامور ہیں یا وہ فرشتے جو بندوں کے اعمال کا ریکارڈ لکھنے پر مامور ہیں وغیرہ، انہیں ”کراماً کاتبین“ (معزز لکھنے والے) کہا جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِينَ ۝ كَرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝ ﴿الانفطار : ۱۰-۱۲﴾

”اور بیشک تم پر ضرور نگہبان (مقرر) ہیں، معزز (فرشتے) لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔“

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَلْفُظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ ۝ ﴿ق : ۱۸﴾

”وہ زبان سے کوئی بات نہیں کہتا، مگر اس کے پاس (اس کا) نگہبان لکھنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔“

یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ وہ انسان کے قلبی واردات، وسوسوں، ذہن کے پوشیدہ گوشوں میں مچلنے والی آرزوؤں، تمناؤں اور

خواہشات اور سینوں میں پوشیدہ رازوں کو بھی جانتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ ۝ ﴿ق : ۱۶﴾

”اور بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا اور ہم ان وسوسوں کو (بھی) جانتے ہیں جو اس کا نفسِ امارہ (اس کے ذہن میں) ڈالتا رہتا ہے

اور ہم اس کی شرگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔“

اور ارشاد پاری تعالیٰ ہے:

يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ ۝ ﴿المؤمن : ۱۹﴾

”اللہ جانتا ہے خیانت کرنے والی نگاہوں کو اور جو (راز) سینوں میں پوشیدہ ہیں۔“

یعنی رب ذوالجلال کسی غیر محرم پر پڑنے والی اچانک بے اختیار نظر کو جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ کس مرحلے پر کسی شیطان صفت

انسان کی نظر میں فریبِ نفس اور لذتِ شیطانی پیدا ہوئی اور وہ نفسِ انسانی میں پوشیدہ شرارتوں اور خباثتوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ ہر فرشتے کے لئے ہر بات کا ہر حال میں جاننا ضروری نہیں ہے، اس سلسلے میں یہ حدیث پاک ملاحظہ فرمائیے:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُفَضِّلُ الصَّلَاةَ الَّتِي يُسْتَأْذَنُ لَهَا عَلَى الصَّلَاةِ الَّتِي لَا يُسْتَأْذَنُ

لَهَا بِسَبْعِينَ ضِعْفًا۔

وَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ: يُفَضِّلُ الذِّكْرَ الْخَفِيُّ عَلَى الَّذِي لَا يَسْمَعُ الْحَفَظَةُ بِسَبْعِينَ ضِعْفًا، وَيَقُولُ: إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَمَةِ

وَجَمَعَ اللَّهُ الْخَلَائِقَ لِحِسَابِهِمْ، وَجَاءَتِ الْحَفَظَةُ بِمَا حَفِظُوا وَكَتَبُوا، قَالَ اللَّهُ لَهُمْ: اُنْظُرُوا، هَلْ بَقِيَ لَكُمْ مِنْ شَيْءٍ؟ فَيَقُولُونَ:

رَبَّنَا مَا تَرَكْنَا شَيْئًا مِمَّا عَلَّمْنَاهُ وَحَفِظْنَاهُ إِلَّا وَقَدْ أَحْصَيْنَاهُ وَكَتَبْنَاهُ، فَيَقُولُ اللَّهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَكَ: إِنَّ لَكَ عِنْدَنَا حَبِيبًا لَا

تَعْلَمُهُ، وَأَنَا أُحِيزُكَ [أُحَدِّثُكَ] بِهِ وَهُوَ الذِّكْرُ الْخَفِيُّ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ جس نماز کے لئے (وضو کے وقت) مسواک کی گئی ہو، اسے اس نماز پر ستر درجے فضیلت عطا فرماتے تھے، جس کے لئے مسواک نہ کی گئی ہو“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”وہ ذکر خفی جیسے نگہبان فرشتے (بھی) نہیں سن سکتے، ستر درجے زیادہ فضیلت رکھتا ہے“ اور آپ فرماتے تھے: ”جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ تعالیٰ مخلوق کو ان کے حساب کے لئے جمع فرمائے گا، اور نگہبان فرشتے (وہ سارا ریکارڈ لے کر)، جو انہوں نے محفوظ رکھا ہوگا اور لکھا ہوگا، حاضر ہوں گے، تو اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا: (اچھی طرح) دیکھ لو، کیا اس کے (اعمالِ حسنہ میں) کوئی چیز رہ تو نہیں گئی، تو وہ فرشتے عرض کریں گے: اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایسی کوئی چیز، جسے ہم جانتے تھے اور ہم نے اسے (ریکارڈ میں) محفوظ کر رکھا ہے، نہیں چھوڑی مگر ہم نے اس کا احاطہ کر لیا ہے اور لکھ دیا ہے، تو اللہ تبارک و تعالیٰ ان سے فرمائے گا: ہمارے پاس تمہارے لئے ایک پوشیدہ چیز ہے، جیسے تم نہیں جانتے اور اب میں تمہیں اس کے بارے میں بتاتا ہوں (یا تمہیں اس کے علم کی اجازت دیتا ہوں) اور وہ میرے بندہ کا ”ذکر خفی“ ہے۔

(مختصر اتحاف السادة المهرة بزوائد المسانيد العشرة، کتاب الاذکار رقم الحديث: ۶۸۰۹، اس حدیث

کو حارث، ابو یعلیٰ، احمد بن حنبل، بزار، ابن خزیمہ اور حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث شرط مسلم پر صحیح ہے)

علامہ غلام رسول سعیدی ”تبیان القرآن“ جلد نمبر ۳ ص ۵۰۷-۵۰۸ پر لکھتے ہیں:

آیاد کی باتوں کو کراماً کا تبین لکھتے ہیں یا نہیں؟

بعض احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور ان کو لکھ لیتے ہیں۔

امام مسلم بن حجاج قشیری متوفی ۲۶۱ھ روایت کرتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ”جب میرا بندہ کسی گناہ کا ارادہ کرے تو اس کو نہ لکھو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو اس کا ایک گناہ لکھ لو، اور اگر وہ نیکی کا ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو ایک نیکی لکھ لو اور اگر وہ اس پر عمل کرے تو دس نیکیاں لکھ لو“ امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے اور ایک روایت اس طرح کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”فرشتے عرض کرتے ہیں اے رب! تیرا بندہ گناہ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے، حالانکہ اسے گناہ پر خوب بصیرت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اس کا انتظار کرو، اگر یہ اس گناہ کو کرے تو اس کا گناہ لکھ لو اور اگر اس کو ترک کر دے تو اس کی ایک نیکی لکھ لو، کیونکہ اس نے میری وجہ سے اس گناہ کو ترک کیا ہے۔“

﴿صحیح مسلم، ایمان، ۲۰۵، ۲۰۳، (۱۲۸) ۳۲۷، صحیح البخاری، ج ۸، رقم الحديث: ۷۵۰۱، سنن ترمذی، ج ۵، رقم

الحديث: ۳۰۸۴، سنن کبریٰ للنسائی، ج ۶، رقم الحديث: ۱۱۱۸۱، صحیح ابن حبان، ج ۲، رقم الحديث: ۳۸۰، مسند احمد، ج ۳،

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں اور ارادوں پر مطلع ہوتے ہیں اور بعض دیگر احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کے احوال اور نیات پر مطلع نہیں ہوتے۔

امام عبداللہ بن محمد ابوالشیخ الاصبہانی المتوفی ۳۹۶ھ روایت کرتے ہیں:

”ضمیرہ بن حبیب بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”فرشتے اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کے عمل لے کر اوپر چڑھتے ہیں، اس عمل کو وہ بہت زیادہ اور بہت بابرکت گمان کرتے ہیں، وہ اللہ کی سلطنت میں جہاں تک اللہ چاہتا ہے، اس عمل کو لے کر پہنچتے ہیں۔ اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرماتا ہے تم میرے بندے کے عمل کی حفاظت کرنے والے ہو، اور میں اس کے دل کی نگہبانی کرنے والا ہوں۔ میرے اس بندہ نے یہ عمل میرے لیے اخلاص سے نہیں کیا، اس کو سنجین (جہنم کی ایک وادی) میں ڈال دو۔ اور وہ اللہ عزوجل کے بندوں میں سے ایک اور بندے کے عمل کو لے کر اوپر چڑھیں گے، اور اس عمل کو بہت کم گمان کریں گے۔ پھر وہ اللہ کی سلطنت میں سے جہاں تک اللہ چاہے گا، اس عمل کو لے کر پہنچیں گے۔ پھر اللہ عزوجل ان کی طرف وحی فرمائے گا تم حفاظت کرنے والے ہو اور جو کچھ اس کے دل میں ہے، میں اس پر نگہبان ہوں۔ اس کے اس عمل کو دگنا چوگنا کر دو اور اس کو علیین میں ڈال دو۔“

﴿کتاب العظمة، رقم الحديث: ۵۲۲، ص ۱۸۵، مطبوعه بيروت، کتاب الزهد لابن المبارك، رقم الحديث: ۴۵۲، مطبوعه بيروت﴾

امام ابن المبارک کی روایت میں ہے ”میرے اس بندے نے اخلاص سے عمل کیا ہے، اس کو علیین میں لکھ دو۔“
بہ ظاہر ان حدیثوں میں تعارض ہے، لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع ہوتے ہیں۔ وہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، صحیح ابن حبان اور سنن ترمذی اور سنن نسائی کی روایت ہے اور جس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر مطلع نہیں ہوتے، وہ کتاب العظمة اور کتاب الزهد کی روایت ہے، اور ثانی الذکر کتابیں اول الذکر کتابوں کے پائے کی نہیں ہیں۔ نیز اول الذکر حدیث متصل ہے اور ثانی الذکر مرسل روایت ہے، اور اول الذکر سنداً صحیح ہے اور ثانی الذکر سنداً ضعیف ہے۔ اس لئے ترجیح پہلی حدیث کو ہے اور رائج یہی ہے کہ فرشتے دل کی باتوں پر بھی مطلع ہوتے ہیں اور مؤخر روایت کی یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ریا اور اخلاص کو مستثنیٰ فرمایا ہے، اخلاص کو مخفی رکھا، تاکہ قیامت کے دن اس بندے کی عزت افزائی کی جائے، اور ریا کو مخفی رکھا، تاکہ ریا کار کے عمل کی قیامت کے دن زیادہ رسوائی ہو، جیسا کہ اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔

البتہ احادیث مبارکہ، روایات اور احوال سیرت النبی ﷺ میں متعدد واقعات مروی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم غیب سے بارہا لوگوں کے احوال قلبی اور واردات قلبی کو ان کے بتانے سے پہلے بتا دیا۔ ”اس بات کا میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہے۔“ یہ اردو زبان کا محاورہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات میرے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی یا اس بات کی بابت میں نے کبھی

سوچا تک نہیں۔ یعنی اگر میں نے ایسا سوچا ہوتا یا اس کی منصوبہ بندی کی ہوتی تو فرشتوں یا ”کرام کاتبین“ کو علم ہوتا، اس سے معاذ اللہ، فرشتوں کی توہین یا تنقیص مقصود نہیں ہوتی کہ اسے کفر یا ضلالت یا فسق پر محمول کیا جائے۔

انبیاء کرام کی تعداد کتنی ہے؟

سوال:

انبیاء کرام کی تعداد کتنی ہے، دلیل اور حوالے کے ساتھ بتائیے؟ ﴿مولانا علی عمران صدیقی، اورنگی ٹاؤن، کراچی﴾

جواب:

قرآن مجید میں سورۃ النساء آیت نمبر ۱۶۳ میں متعدد انبیاء کرام علیہم السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

”ترجمہ: (اے حبیب!) بلاشبہ ہم نے آپ کی طرف وحی (نازل) فرمائی، جیسے ہم نے نوح اور ان کے بعد دوسرے انبیاء کی طرف وحی (نازل) فرمائی اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کے بیٹوں کی طرف عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف وحی (نازل) فرمائی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔“ اس کے بعد اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ۔

”اور ہم نے ایسے رسول (بھیجے) جن کا قصہ ہم نے اس سے پہلے آپ کو بیان فرمایا اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا قصہ ہم نے آپ سے (ابھی تک) بیان نہیں کیا۔“

یعنی اسی مفہوم کی آیت سورۃ المؤمن میں بھی موجود ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ۔ ﴿المؤمن: ۷۸﴾

”اور بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے (بھی) رسول بھیجے، ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ پر بیان فرمادیا ہے اور ان میں سے بعض کا حال آپ پر (ابھی تک) بیان نہیں فرمایا۔“

سارے انبیاء کرام و رسل عظام علیہم السلام کے اسماء مبارکہ اور احوال قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں، تاہم جن انبیاء کرام کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے، ان کے اسماء مبارکہ یہ ہیں:

- | | |
|-----------------------------|-----------------------------|
| ۱۔ حضرت آدم علیہ السلام | ۲۔ حضرت نوح علیہ السلام |
| ۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام | ۴۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام |

- | | |
|----------------------------|---|
| ۵۔ حضرت اسحاق علیہ السلام | ۶۔ حضرت یعقوب علیہ السلام |
| ۷۔ حضرت یوسف علیہ السلام | ۸۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام |
| ۹۔ حضرت ہارون علیہ السلام | ۱۰۔ حضرت شعیب علیہ السلام |
| ۱۱۔ حضرت لوط علیہ السلام | ۱۲۔ حضرت ہود علیہ السلام |
| ۱۳۔ حضرت داؤد علیہ السلام | ۱۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام |
| ۱۵۔ حضرت ایوب علیہ السلام | ۱۶۔ حضرت الیاس علیہ السلام |
| ۱۷۔ حضرت الیسع علیہ السلام | ۱۸۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام |
| ۱۹۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام | ۲۰۔ حضرت یونس علیہ السلام |
| ۲۱۔ حضرت ادريس علیہ السلام | ۲۲۔ حضرت ذوالکفل علیہ السلام |
| ۲۳۔ حضرت صالح علیہ السلام | اور ۲۴۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ |

ان کے علاوہ سورۃ الکہف میں حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہے لیکن ان کا نام مذکور نہیں ہے، ان کے بارے میں دو قول ہیں ایک یہ کہ وہ نبی تھے اور دوسرا یہ کہ وہ نبی نہیں تھے لیکن رائج قول یہی ہے کہ وہ نبی تھے، اسی طرح حضرت لقمان کے بارے میں بھی دو قول ہیں لیکن قول رائج یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے بلکہ ایک مردِ حکیم و دانائے تھے۔

باقی رہا یہ سوال کہ انبیاء کرام کی کل تعداد کتنی ہے تو اس سلسلے میں مسند امام احمد بن حنبل میں ایک طویل حدیث مذکور ہے۔ جس میں آگے چل کر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”قال: قلت يا رسول الله! كم وفى عِدَّة الانبياء؟ قال: مائة الف و اربعة و عشرون الفاء، الرسل من ذلك ثلثمائة و

خمسة عشر جما غفيرا۔“

”(حضرت ابو ذر) بیان کرتے ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! انبیاء کرام کی کتنی کتنی پوری ہوئی؟ فرمایا: ایک لاکھ چوبیس ہزار، ان میں سے رسول تین سو پندرہ کا جم غفیر (بڑی جماعت) ہے۔“ ﴿مسند امام احمد رقم الحديث: ۲۲۱۸۹﴾

علامہ غلام رسول سعیدی نے تیان القرآن جلد اول صفحہ ۶۱۹ پر ”نبیوں، رسولوں اور صحیفوں کی تعداد کی تحقیق کے عنوان کے تحت اس موضوع پر متعدد روایات باحوالہ جمع کی ہیں، جن میں سے ایک درج ذیل ہے:

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ انبیاء کتنے ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک لاکھ چوبیس ہزار، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! رسول کتنے ہیں آپ نے فرمایا تین سو تیرہ جم غفیر ہیں، میں نے کہا بہت اچھے ہیں، میں نے کہا یا رسول

اللہ! پہلا نبی کون ہے؟ آپ نے فرمایا آدم، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا وہ نبی مرسل ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور ان میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی پھر ان کو اپنے سامنے بنایا، پھر آپ نے فرمایا: اے ابوذر چار نبی سریانی ہیں آدم، شیث، اورخنوخ، یہ ادریس ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قلم سے خط کھینچا اورنوح، اورچار نبی عرب ہیں: ہود، صالح، شعیب اورتمہارے نبی، اے ابوذر! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل کیں، آپ نے فرمایا سو صحیفے اورچار کتابیں، شیث پرپچاس صحیفے نازل کیے گئے، خنوخ پرتمیں صحیفے نازل کیے گئے، ابراہیم پردس صحیفے نازل کیے گئے اورموسیٰ پرتورات سے پہلے دس صحیفے نازل کیے گئے اورتورات، انجیل، زبور اورفرقان کو نازل کیا گیا۔“

﴿حلیۃ الاولیاء ج ۱، ص ۱۶۷، مطبوعہ دارالکتاب العربی بیروت، ۵۱۴۰۷﴾

اس حدیث کو امام ابن حبان نے بھی اپنی صحیح میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔“

﴿مواردالظمان، ص ۵۴-۵۲، مطبوعہ دارالکتاب العلمیہ بیروت﴾

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ بعض روایات میں رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ مذکور ہے اور بعض میں تین سو پندرہ ہے۔ اگرچہ اکثر روایات میں انبیاء کرام کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار مذکور ہے اور ہم ان احادیث کی روشنی میں اس تعداد کا بطور تعین ذکر کر سکتے ہیں، لیکن افضل واولیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب مقدس قرآن مجید کی اتباع کرتے ہوئے ہم اجمالاً اپنے عقیدے کو اس طرح بیان کریں کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف اوقات میں اپنے جن برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا ہے، وہ سب برحق تھے اور ہم سب پر ایمان لاتے ہیں، ہم تعداد کی تعین کے مکلف نہیں ہیں، کیونکہ روایات و احادیث کی روشنی میں تعداد متعین کر لی جائے تو ان سب کے اسماء مبارکہ تو پھر بھی ہمارے علم میں متعین نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ

رُسُلِهِ۔ ﴿البقرة: ۲۸۶﴾

”رسول مکرم ایمان لائے اس کلام پر جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا اور مومن (بھی ایمان لائے)، سب (کے سب) ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر، اور اس کے رسولوں پر، (یہ اقرار کرتے ہوئے) کہ ہم (ایمان لانے میں) اس کے رسولوں میں کوئی فرق نہیں کرتے (کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض کا انکار کر دیں)۔“

قیامت کے دن کس کی نسبت سے پکارا جائے گا؟

سوال:

ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ جب قیامت کے دن میدانِ حشر میں پکار ہوگی تو انسان کو کس نام کے ساتھ پکارا جائے گا؟ اپنی والدہ کے نام سے یا اپنے والد کے نام سے پکارا جائے گا۔ ہمیں قرآن مجید اور حدیث پاک کی روشنی میں اس کا جواب چاہئے؟ ﴿محمد اختر..... کراچی﴾

جواب:

قرآن مجید کی کسی آیت میں صراحت کے ساتھ یہ مسئلہ بیان نہیں کیا گیا، البتہ قرآن مجید کی اس آیت کے تحت مفسرین کرام نے اس مسئلے پر گفتگو فرمائی ہے:

يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ - ﴿الاسراء: ٧١﴾

”جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ہمراہ بلائیں گے۔“

اس آیت مبارکہ کا واضح معنی تو یہ ہے کہ قیامت میں لوگوں کو ان پیشواؤں کے ہمراہ حساب و کتاب اور سوال و جواب کے لئے بلایا جائے گا۔ انبیاء کرام اپنی اپنی امتوں کے ہمراہ بارگاہِ رب العالمین میں حاضر ہوں گے، اور ائمہ کے ہمراہ ان کے پیروکاروں کو طلب کیا جائے گا۔ چنانچہ جو گمراہ اور باطل پرست لوگ ہیں، وہ اپنی عذرخواہی اس انداز میں کریں گے:

رَبَّنَا اِنَّا اطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبرَاءَنَا فَافْضَلُونَا السَّبِيلَا ۝ رَبَّنَا اَتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنُّهُمْ لَعْنَا كَبِيرَا ۝

﴿الاحزاب: ٦٧، ٦٨﴾

”اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے سرداروں اور وڈیروں کی پیروی کی، تو انہوں نے ہمیں راہ (راست) سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! انہیں (ہمارے مقابلے میں) دگنا عذاب دے اور ان پر بڑی بھاری لعنت فرما۔“

تاہم بعض مفسرین نے زیر بحث آیت میں لفظ ”امام“ کو ام (بمعنی ماں) کی جمع قرار دے کر ایک نئے انداز سے اس کی تفسیر کی ہے، ذیل میں ہم چند تفاسیر کے حوالہ جات درج کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کی تفسیر کا یہ نیا انداز سب سے پہلے علامہ زنجشیری صاحب ”تفسیر کشاف“ نے اختیار کیا ہے۔

نئے انداز کی تفسیر یہ ہے کہ ”امام“ ام (بمعنی ماں) کی جمع ہے اور یہ کہ لوگوں کو قیامت کے دن ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا اور (باپوں کے بجائے) ماؤں کے نام کے ساتھ پکارنے میں حکمت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق کی پاسداری ہو جائے

اور حضرت حسن و حسین کا شرف ظاہر کرنا مقصود ہے اور یہ کہ جو لوگ ”ولد الزنا“ ہیں، ان کی (سرعام) رسوائی نہ ہو۔“

﴿تفسیر الکشاف، ج ۲ ص ۶۳۷ دار احیاء التراث العربی، بیروت﴾

علامہ زمخشری کی اس تفسیر کا حوالہ علامہ آلوسی حنفی بغدادی نے بھی دیا ہے، لیکن پھر اسے دلائل سے رد کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”صاحب تفسیر کشاف نے محمد بن کعب سے اسے روایت کیا ہے اور اس تفسیر کے قابل قبول نہ ہونے کے دلائل یہ ہیں: اولاً، اس لئے کہ ”امّ“ کی جمع امام غیر معروف ہے اور اس کی معروف جمع ”امہات“ ہے۔ ثانیاً اس لئے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے حق کی رعایت تو اس میں ہے کہ انہیں ”شانِ امتیازی“ کے طور پر ماں کے نام سے پکارا جائے (یعنی سب کو اگر ماں کے نام سے پکارا جائے تو اس میں ان کا امتیاز کہاں رہے گا؟)، کیونکہ باپ کے بغیر ان کی پیدائش ان کے لئے باعثِ کرامت و افتخار ہے (کیونکہ یہ ایک معجزہ ہے)، تو اس افتخار کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ اس سے چشم پوشی کی کہ اس بنا پر مجبوراً سب کو ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے، اور حضرات حسنین کریمین کا شرف تو ویسے ہی کامل دائم ہے، کیونکہ ان کے باپ کا مرتبہ ان کی ماں سے زیادہ ہے، اور رہے ”اولاد الزنا“ تو اس میں ان کا تو کوئی گناہ نہیں ہے جو ان کے لئے باعثِ رسوائی ہو، رسوائی تو ان کی ماؤں کے لئے ہے (اور یہ قائم رہتی ہے) خواہ دوسروں کو ان کی ماؤں کے نام سے پکارا جائے یا ان کے باپوں کے نام سے۔“

اس کے بعد علامہ آلوسی نے ان اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے، جس میں اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ کہ ”امّ“ کی جمع امام معروف نہیں ہے، لیکن حضرات حسنین کریمین کی نسبت ماں کی طرف کرنے سے ان کی نسبی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف ہونا، بہت بڑا شرف ہے۔ اس طرح ”اولاد الزنا“ کے رسوائی سے بچنے کی بھی تاویل کی ہے کہ ماں کی نسبت تو دنیا میں بھی لوگوں کو معلوم تھی، لیکن باپ کی نسبت معلوم ہونے پر رسوائی ہوگی۔ لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ ممکن ہے ”صاحب کشاف“ کا موقف کسی روایت پر مبنی ہو، لیکن وہ حدیث صحیح کے معارض ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ

”قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا۔“

﴿روح المعانی ج ۹ ص ۱۷۶-۱۷۵ مطبوعہ دار الفکر بیروت﴾

امام ابو عبد اللہ محمد بن احمد انصاری قرطبی مالکی حکماء کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ: ”اور امام، امّ کی جمع ہے، حکماء نے کہا ہے اس میں تین حکمتیں ہیں، ایک عیسیٰ علیہ السلام کے سبب، دوسری حضرات حسنین کریمین کے شرف کا اظہار اور تیسرا یہ کہ اولاد الزنا کی رسوائی نہ ہو۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ قول محلِ نظر ہے، کیونکہ حدیث صحیح میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: جب اللہ تعالیٰ اولین و آخرین کو قیامت کے دن جمع فرمائے گا، تو ہر بدعہد کے لئے ایک (علامتی) جھنڈا ہوگا اور کہا جائے گا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی (کا نشان) ہے، یہ حدیث متفق علیہ ہے، اس حدیث میں ”فلاں بن فلاں“ کے الفاظ ہیں نہ کہ ”فلاں بن فلاں“ کے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

آخرت میں لوگوں کو ان کے ناموں اور ان کے باپوں کے ناموں سے پکارا جائے گا اور یہ ان لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی ماؤں کی نسبت سے پکارا جائے گا۔“ ﴿الجامع لاحکام القرآن ج ۵ ص ۲۶۷﴾

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قیامت کے دن ماؤں کے ناموں کے ساتھ پکارے جانے کے قول کو ان کی تمام تر عقلی توجیہات اور فلسفیانہ موشگافیوں کے باوجود جلیل القدر مفسرین کرام علامہ محمود آلوسی اور علامہ قرطبی مالکی نے حدیث صحیح سے معارض ہونے کی بناء پر رد کیا ہے اور حدیث صحیح کو عقلی توجیہات پر ترجیح ہے۔

حدیث پاک میں ہے: حضرت ابوالدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن تمہیں تمہارے ناموں اور تمہارے باپوں کے نام سے پکارا جائے گا، تو اپنے نام اچھے رکھا کرو۔ ﴿مشکوٰۃ ص ۲۰۸﴾

اس حدیث کے تحت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ المصابیح میں لکھتے ہیں: ”بعض روایات میں آیا ہے کہ روز قیامت لوگوں کو ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا اور اس کی حکمت یہ بیان کی اولادِ ناکوشر مساری نہ ہو اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے حال کی رعایت کہ اللہ نے ان کو بن باپ کے پیدا کیا اور حضرات حسنین کی شرافت نسبت کے اظہار کے لئے کہ رسول اللہ ﷺ کی نسبت کا اظہار ہو، اگر یہ روایت پایہ ثبوت کو پہنچ جائے تو حدیث کی توجیہ کی جائے کہ لفظ ”آباء“ تغلیب کے طور پر آیا ہے (جیسے حکم تو مردوزن سب کے لئے ہوتا ہے لیکن صیغہ مذکر کا آتا ہے) جیسے ماں باپ دونوں کو ”أَبَوَيْنِ“ کہا جاتا ہے، اور کبھی آباء کہا جاتا ہے، اور کبھی امہات، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بعض کو باپوں کے ناموں سے پکارا جائے اور بعض لوگوں کو ماؤں کے ناموں سے، یا بعض مواقع پر ماؤں کے ناموں سے اور بعض مواقع پر باپوں کے ناموں سے، واللہ اعلم۔“ ﴿اشعۃ اللمعات۔ ج ۴ ص ۵۰ مطبوعہ لکھنؤ﴾

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تاویلات و توجیہات اس پر موقوف ہیں کہ ماں کے نام سے پکارے جانے کی روایت صحیح ہو۔ اسی حدیث کی شرح میں صاحب عون المعبود لکھتے ہیں:

طبرانی نے سند ضعیف کے ساتھ روایت کیا ہے، جیسے کہ ابن قیم نے سنن ابی داؤد کے حاشیے میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ بعض بندوں کی پردہ داری کے لئے ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا، علقمی نے کہا ہے کہ دونوں روایات میں تطبیق اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ صحیح النسب لوگوں کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا، اور سنن ابی داؤد کی روایت اسی سے متعلق ہے، اور طبرانی کی حدیث دوسروں سے متعلق ہے، یا یہ کہ بعض کو باپ کے نام سے پکارا جائے گا اور بعض کو ماں کے نام سے۔

تفہیم المسائل جلد اول میں ہم نے ”حدیث صحیح“ ہی کو رائج قرار دیا تھا اور اب بھی ہمارا موقف یہی ہے، تاہم دیگر روایات، اقوال، توجیہات اور تاویلات بھی درج کر دی ہیں۔ واللہ و رسولہ اعلم بالصواب

مسئلی اختلافات سے ذہنی اضطراب

سوال:

ہمارے ملک میں، جو مسلمانوں کا ملک ہے، کئی مسالک اور مذہبی مکاتب فکر (Schools of Thought) پائے جاتے ہیں، ہر ایک نے اپنی الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا رکھی ہے، ہر ایک اپنے آپ کو حق اور دوسرے کو باطل سمجھتا ہے، خالص دین اسلام کی دعوت دینے والا کوئی نہیں، فقط صرف مسالک کی طرف دعوت دی جاتی ہے، ایسے حالات میں عام آدمی کیا کرے؟ سادہ لوح بندے کدھر جائیں؟ کوئی غیر مسلم اسلام سے متاثر ہو تو کیا کرے؟۔ ان حقائق و واقعات پر غور کرتے ہیں تو شدید ذہنی اضطراب میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ازراہ کرم بتائیے کہ اس مشکل کا حل کیا ہے؟ ﴿عبداللہ۔ پی ای سی ایچ الیس۔ اور متعدد دوسرے افراد﴾

جواب:

میں نے آپ سب حضرات کے مفصل خطوط کو کافی غور اور توجہ سے پڑھا ہے۔ اس مفہوم پر مشتمل گفتگو اکثر محافل میں ہوتی ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کرنے والے لوگ اکثر پڑھے لکھے اور جدید تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، یہ دو قسم کے لوگ ہیں۔ ان میں سے ایک طبقہ وہ ہے جو تلاش حق میں سرگرداں ہے، یہ لوگ حق کو جاننے، اسے قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے دل و جان سے آمادہ ہیں، ان کا ذہنی اضطراب اور تلاش حق کے لئے بے قراری لائق تحسین ہے، ان کا جذبہ قابل قدر ہے اور وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب کے حقدار ہوں گے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو شرح صدر کے ساتھ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کی باہمی فکری آویزش اور بین المسالک مسلکی تصادم سے اسلام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے، غلبہ اسلام کی جدوجہد نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو رہی اور اس سے لادینی قوتوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو مسلمانوں کی باہمی فکری آویزش اور مسلکی تصادم کو مذہب سے گریز اور انحراف کے لئے ایک بہانہ اور وجہ جواز (Justification) بنانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ اور طرز فکر قابل مذمت ہے اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ تاہم نیتوں کا حال اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا ہے، ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ ہم شخصی طور پر کسی کے بارے میں بدگمانی کریں۔ لہذا ہر ایک کو اپنی علمی استعداد اور فکری استطاعت کے مطابق مطمئن کرنا ہماری دینی ذمہ داری ہے۔

سوچ اور فکر کا اختلاف (Approach) اور اختلاف رائے انسان کی فطرت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خلاقی صناعی اور قدرت ہے کہ اس نے انسانوں کی صورتوں کے ساتھ ساتھ ان کے اذہان میں بھی بڑا تنوع (Variety And variation) پیدا فرمایا ہے۔ آپ کو ایسے دو انسان بہت کم ملیں گے یا شاید بالکل نہ ملیں، جن کی ذہنی سوچ ہر چیز کے بارے میں یکساں ہو۔ لہذا اختلاف فکر و نظر آپ کو حیات اجتماعی کے ہر شعبے میں نظر آئے گا۔ کسی مقدمے کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے اور قطعی فیصلے تک پہنچنے میں آئین کی تعبیر و

تشریح (Interpretation) اور قوانین کے اطلاق (Application) میں اعلیٰ عدالتوں کے ججوں میں اختلاف ہوتا ہے، حالانکہ مقدمے کے حقائق و واقعات ان سب کے سامنے یکساں طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح قوانین کی تعبیر و تشریح میں ماہرین قانون کے درمیان اختلاف رائے ہوتا ہے۔ مرض کی تشخیص (Diagnosis) میں ماہر ڈاکٹروں کے درمیان بعض اوقات اختلاف رائے ہوتا ہے۔ اسی طرح سیاست، معیشت اور حیاتِ انسانی کے دیگر شعبوں میں بھی اختلافات موجود ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ ان تمام شعبوں کی بساطِ کار لپیٹ دی جائے یا ڈاکٹرز سے علاج کرانا چھوڑ دیا جائے، کیونکہ اختلافات ہیں اور بندہ کس کی سنے اور کدھر جائے۔ اس کے برعکس ہر عقلمند انسان اپنی تمام تر ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے بہتر سے بہتر کی جستجو جاری رکھتا ہے، اندھی تقلید (Blind Faith) کسی کی نہیں کرتا۔ لہذا مذہب کے معاملے میں بھی ہمیں اپنی خداداد صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے حق و صواب کو سمجھنے اور پانے کی کوشش کرنی چاہئے اور اس امر کا اہتمام کرنا چاہئے کہ اسلام کے بنیادی معتقدات سے روگردانی نہ ہونے پائے۔ اختلافات تو دنیا کے تمام مذاہب میں ہیں، خواہ وہ الہامی مذاہب (Revealed Religion) ہوں یا انسانوں کے خود ساختہ مذاہب ہوں، مثلاً یہودیت، مسیحیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ۔

لہذا اولاً تو ہم میں سے ہر ایک کو اس امر کی آگاہی ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اور اصول و نظریات کیا ہیں؟ اور پھر یہ جاننا ہوگا کہ کون سا مسلک یا مکتبہ فکر کتاب و سنت کے عین مطابق ہے کہ جس میں توحید، ناموس الوہیت و ناموس رسالت و عقیدہ ختم نبوت کی مکمل پاسداری ہو، جو رسالت مآب ﷺ، اصحاب رسول اور ان کے اتباع سلف صالحین، ائمہ مجتہدین، اولیاء کرام اور علماء ربانین کے طریق پر ہو۔ کیونکہ ہم ہر نماز میں سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتے ہیں:

” (اے اللہ!) ہمیں سیدھی راہ پر چلا، ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا، ان لوگوں کی راہ نہیں جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی جو گمراہ ہوئے۔“

پھر قرآن مجید نے دوسرے مقام اپنے ان انعام یافتہ بندوں، جن کی حیات کو ہمارے لئے مشعلِ راہ قرار دیا ہے، کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمادی: ”اور جس نے اللہ اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کی تو وہ لوگ (حشر میں) ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی جو اس کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور عباد صالحین ہیں۔“

اور اللہ تعالیٰ نے حق و باطل، صواب و خطاء، نور و ظلمت اور خیر و شر میں تمیز کا ملکہ ہر انسان کی فطرت میں ودیعت فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا: ”کیا ہم نے انسان کو (دیکھنے کے لئے) دو آنکھیں (بولنے کے لئے) ایک زبان اور دو ہونٹ عطا نہیں کئے اور ہم نے اسے (خیر و شر کی) دونوں راہوں کو سمجھا دیا ہے۔“

﴿البلد: ۸ - ۱۰﴾

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”انسان اپنی ذات پر کامل بصیرت کے ساتھ (شاہد) ہے، خواہ وہ کتنے ہی عذر تراشتا رہے، (القیامہ)۔“ جب انسان تلاشِ حق (In Search of Truth) میں آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نورِ ہدایت اس کی رہنمائی فرماتا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”بھلا اللہ تعالیٰ جس کے سینے کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دے، تو وہ اپنے رب کی جانب سے ایک (عظیم) نور (معرفت) سے فیض یاب ہوتا ہے۔“ ﴿الزمر: 22﴾

رسول اللہ ﷺ نے مستقبل کی خبر دیتے ہوئے پہلے ہی ہماری رہنمائی فرمادی تھی کہ جب مسلمان مختلف فرقوں میں بٹ جائیں تو صرف وہ گروہ ہدایت یافتہ اور حق و صواب پر ہوگا جو: ”اس جادہ مستقیم پر (سختی سے) کار بند ہو، جس پر میں اور میرے اصحاب (ہمیشہ) کار بند رہے ہیں۔“ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کا دست (تائید و حمایت) جماعت پر ہوتا ہے۔“ اس لئے فرمایا: ”جماعت (کی اتباع) کو لازم پکڑو، کیونکہ جو بکری ریوڑ سے جدا ہو کر دور چلی جاتی ہے یا ایک جانب کو ہو جاتی ہے اسے بھیڑ یا شکار کر لیتا ہے۔“ یہ بھیڑیا، یہ دشمنِ ایمان، شیطان ہے۔ اور خود اللہ جل شانہ کا فرمان ہے:

”جو شخص مومنوں کی (اجماعی راہ کو چھوڑ کر) کسی دوسری راہ کو اختیار کرے گا، ہم اسے اسی رخ پر پھیر دیں گے، جسے اس نے (از خود) اختیار کر لیا ہے اور اسے ہم جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے۔“ ﴿النساء: 115﴾

﴿کتاب الطہارت﴾

محض خواب دیکھنے پر غسل کا وجوب؟

سوال:

ایک شخص مباشرت کا خواب دیکھتا ہے لیکن جب صبح بیدار ہو کر اٹھتا ہے تو اس کے بدن یا لباس پر کوئی داغ، دھبہ یا نشان نہیں ہوتا تو کیا محض خواب دیکھنے سے اس پر غسل جنابت فرض ہو جاتا ہے؟ ﴿مظہر کمال - گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

محض احتلام کا خواب دیکھنے پر، جبکہ بیدار ہونے پر اس کے جسم پر یا لباس پر کوئی داغ، دھبہ یا نشان نہ ہو، اس پر غسل جنابت فرض نہیں ہوتا اور وہ شرعاً پاک ہے۔

ناپاک بدن پر پاک کپڑے

سوال:

ایک شخص جس پر غسل جنابت فرض ہے، وہ کسی ضروری کام کی بنا پر غسل کئے بغیر پاک کپڑے پہن لیتا ہے، تو کیا محض حالت جنابت میں پہننے سے پاک کپڑا ناپاک ہو گیا یا بعد میں غسل کر کے پاک ہو کر اسی لباس کو پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے؟

﴿مظہر کمال - گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

پاک کپڑا محض حالت جنابت میں پہننے سے ناپاک نہیں ہوتا، وہ بعد میں غسل کر کے پاک ہو کر اور دوبارہ وہی لباس پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ انسان کا پسینہ بھی ناپاک نہیں ہوتا۔ لہذا حالت جنابت میں کسی کو پسینہ آ گیا اور پاک کپڑا بدن سے مس ہو گیا تو ناپاک نہیں ہوگا۔ اسی طرح بیوی یا شوہر میں سے کوئی ایک ناپاک ہے اور دوسرے کا بدن اس سے مس ہو گیا تو وہ اس سے ناپاک نہیں ہوگا البتہ اگر بدن پر مٹی یا خون کا دھبہ ہے اور پاک کپڑا پہن لیا ہے اور پسینہ آنے سے وہ ناپاک کپڑے پر لگ گئی تو کپڑے کے اس حصے کو دھو کر پاک کر لیں، باقی لباس پاک رہے گا۔

ناپاک کپڑا پہننے سے کیا بدن ناپاک ہو جاتا ہے؟

سوال:

ایک شخص کے کپڑوں پر پیشاب یا کوئی اور ناپاکی (مثلاً پاخانہ وغیرہ) لگ جاتا ہے اور وہ اس کے جسم کے کسی حصے پر نہیں لگتا، تو وہ شخص اگر با وضو ہے تو ناپاک کپڑے اتار کر اور ناپاک کپڑے پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے؟ ﴿مظہر کمال۔ گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

محض ناپاک کپڑا پہننے سے بدن ناپاک نہیں ہوتا بشرطیکہ نجاست بدن پر نہ لگے۔ البتہ اگر نجاست مرطوب ہونے کی بناء پر بدن پر لگ جاتی ہے یا بدن کسی وجہ سے پانی یا پسینے سے تر ہو گیا اور وہ نجاست اس پر لگ گئی تو اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، صرف اس ناپاک جگہ کو دھو لے، وضو بدستور قائم رہے گا۔

جلد سے جڑے ہوئے مصنوعی بالوں کی طہارت کا مسئلہ؟

سوال:

آج کل جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مستقل بنیادوں پر جو مصنوعی بال لگائے جا رہے ہیں کیا ایسے بال لگوا کر طہارت حاصل کی جاسکتی ہے کیونکہ ان بالوں کو جلد کے ساتھ مستقل طور پر جوڑ دیا جاتا ہے؟ ﴿شمیم یاسر۔ شاہ فیصل کالونی، کراچی﴾

جواب:

اگر یہ بال جلد کے ساتھ جڑ گئے ہیں یعنی انہیں ظاہراً کی ہوئی شکل یا مستقل پیوستگی کی شکل میں کر دیا گیا ہے تو وہ اصل بالوں ہی کے حکم میں ہوں گے بشرطیکہ وہ بال کسی ناپاک اور حرام چیز سے نہ بنائے گئے ہوں یا کسی حرام جانور کے نہ ہوں، کیونکہ ایسی صورت میں ان کے ہوتے ہوئے طہارت ممکن ہی نہیں رہے گی اس لئے کہ جو چیز اصلاً ناپاک ہو اسے دھو کر پاک نہیں کیا جاسکتا۔ دھونے سے صرف وہ چیز پاک ہو سکتی ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے پاک ہو لیکن اس کو حقیقی، حکمی یا مصنوعی نجاست لاحق ہوئی ہو۔ یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اگر مصنوعی بال فی نفسہ پاک ہوں تو وہ اصل بالوں کے حکم میں ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ جن مواقع پر اصل بالوں کے لئے مسح کافی ہے، وہاں ان پر بھی مسح کافی ہوگا اور جہاں اصلی بالوں کو دھونا اور ان کی جڑوں تک پانی کا پہنچنا ضروری ہے وہاں ان کا بھی وہی حکم ہوگا۔

حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ کو غسل دینا (وضاحتی نوٹ)

میں نے کامران قریشی کے استفسار پر، شوہر کے اپنی بیوی کی میت کو غسل دینے کے مسئلے پر، ایک مقامی اخبار میں شائع شدہ اور

ایک مفتی صاحب سے منسوب ایک فقہی مسئلے کی تصحیح کی تھی، جو جمعہ ۱۵ ستمبر کی اشاعت میں آچکی ہے۔ ہمارے ایک اور قاری سید عمیر الحسن برنی، جو ماشاء اللہ دینی مسائل کا ذوق رکھتے ہیں، کے توجہ دلانے پر اس مسئلے کی مکمل تشریح و توضیح کے لئے یہ سطور درج کی جا رہی ہیں۔ یہ ساری تفصیل فتاویٰ شامی مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت جلد نمبر ۳ ص ۸۵ سے ماخوذ ہیں۔ علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں:

”شوہر کے لئے اپنی بیوی کی میت کو غسل دینا اور چھونا منع ہے، صحیح ترین قول کے مطابق دیکھنا منع نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ جائز ہے کیونکہ حضرت علی نے بی بی فاطمہ کو غسل دیا تھا، ہم جواباً کہتے ہیں کہ حضرت علی کا غسل دینا اس پر محمول ہے کہ ان کا بی بی فاطمہ کے ساتھ رشتہ زوجیت بعد از وفات بھی قائم تھا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”رشتہ نکاح اور رشتہ نسب موت کے ساتھ منقطع ہو جاتا ہے، سوائے میرے رشتہ نکاح اور میرے رشتہ نسب کے۔“ حالانکہ بعض صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تھا۔ (نوٹ اس روایت کو حاکم نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد ہے (۱۳۲/۳) اور علامہ ذہبی نے ان کا تعاقب کرتے ہوئے اسے منقطع کہا ہے۔)

علامہ ابن عابدین شامی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: شوہر کے اپنی بیوی کو غسل دینے کی ممانعت سے البحر الرائق کی اس عبارت کی طرف اشارہ ہے کہ غاسل کے لئے شرط یہ ہے کہ اس کے لئے مغسول (جسے غسل دیا جائے) کی طرف دیکھنا جائز ہو، یہی وجہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کو غسل نہیں دے سکتے، اور عنقریب یہ مسئلہ آئے گا کہ مرد کا انتقال ہو جائے اور صرف عورتیں ہوں یا عورت کا انتقال ہو جائے اور صرف مرد ہوں تو کیا کریں؟ ظاہر یہ ہے کہ غاسل کے لئے مغسول کو دیکھنے کے جواز کا مسئلہ غسل کے وجوب یا جواز کے لئے شرط ہے، صحت غسل کے لئے نہیں۔ ”شوہر کے لئے بیوی کی میت کو دیکھنا منع نہیں ہے۔“ ”منہ“ میں اس قول کو ”القنیہ“ کی طرف منسوب کیا ہے اور فتاویٰ خانہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا کہ اگر مردہ عورت کا محرم مرد ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے تیمم کرائے اور اگر اجنبی مرد ہے تو اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرائے اور نگاہیں اس کے بازوؤں پر نہ ڈالے، اسی طرح شوہر اپنی بیوی کو تیمم کرائے مگر اس کے لئے نگاہیں نیچے رکھنے کی پابندی نہیں ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چھونے سے دیکھنا کم تر چیز ہے۔ ہم کہتے ہیں ”شرح الجمع“ کے مصنف نے کہا ہے (در حقیقت) حضرت فاطمہ کو ان کی دائی ام ایمن نے غسل دیا تھا۔ حضرت علی کے غسل دینے کی روایت اس پر محمول ہے کہ انہوں نے تیاری کی تھی اور سارا سامان فراہم کیا تھا، اور اگر یہ (غسل علی کی) روایت درست بھی ہو تو ان کی خصوصیت پر محمول ہے، یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن مسعود نے اعتراض کیا تو حضرت علی نے جواب دیا کہ ”کیا تمہیں معلوم نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: بے شک فاطمہ دنیا اور آخرت (دونوں) میں تمہاری بیوی ہے۔“ (اس روایت کو امام شافعی، امام دارقطنی، امام بیہقی اور امام ابو نعیم نے سند حسن کے ساتھ روایت کیا ہے۔) یہ اس امر کی دلیل ہے کہ صحابہ کرام کے نزدیک عام حکم شرعی یہی تھا کہ شوہر کے لئے اپنی بیوی کو غسل دینا جائز نہیں ہے اور حضرت علی اپنے لئے خصوصیت کے دعویدار تھے۔

نفاس کی مدت

سوال:

اکثر خواتین بچے کی ولادت کے بعد سوامہینے یعنی چالیس دن تک غسل نہیں کرتیں، اس مدت کے دوران نماز، تلاوت سب کچھ موقوف ہو جاتا ہے، کیا یہ درست ہے؟ ﴿رخسانہ شا کر۔ گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

زچگی (Delivery) یعنی بچے کی ولادت کے بعد عورت کے رحم سے جو خون جاری ہوتا ہے، اسے نفاس کہتے ہیں، اس کی زیادہ سے زیادہ ممکنہ مدت چالیس دن ہے، یعنی چالیس دن تک اگر خون جاری رہا تو اسے نفاس ہی سمجھا جائے گا، اور وہ شرعاً ناپاک رہے گی، اور اس عرصے کی نمازیں اسے معاف ہیں، لہذا ان کی قضا بھی اس پر نہیں ہے۔ اس عرصے میں رمضان کا روزہ رکھنا بھی منع ہے، لیکن روزہ معاف نہیں ہے، بعد میں اس کی قضا لازم ہوگی۔ اگر خون چالیس دن پورے ہونے کے بعد بھی جاری رہے تو اب یہ نفاس نہیں ہے، بلکہ استحاضہ ہے، یعنی سیلان الرحم کی بیماری ہے۔ اب نفاس والی عورت پر لازم ہے کہ غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازیں پڑھے، روزے رکھے اور تلاوت کرے، بیت اللہ کا طواف بھی کر سکتی ہے۔ خون مستقل جاری رہتا ہے تو یہ بیماری ہے اور شرعی عذر ہے، بس اتنا ہے کہ ہر نماز کے لئے تازہ وضو کرے یا ہو سکے تو غسل کرے، اور خون کے قطرے آنے کے باوجود وہ نماز پڑھتی رہے اور تلاوت کرتی رہے۔ نفاس کے لئے کم سے کم کوئی مدت متعین نہیں ہے، لہذا خون جب بھی رک جائے، خواہ ایک دن بعد یا زیادہ دنوں کے بعد، غسل کر کے پاک ہو جائے اور نمازیں شروع کر دے، تلاوت کرے وغیرہ۔ چالیس دن پورے کرنے ضروری نہیں ہیں۔ اگر چالیس دنوں سے کم مدت میں، خواہ ان ایام کی تعداد کوئی بھی ہو، خون بند ہو گیا، لیکن عورت نے غسل کر کے اور پاک ہو کر نمازیں نہیں شروع کیں، تو ان دنوں کی قضا اس پر لازم ہوگی۔

کیا ڈیڑھ سالہ بچی کے پیشاب سے کپڑے ناپاک ہو جاتے ہیں

سوال:

میری بچی ڈیڑھ سال کی ہے، کبھی اس کا پیشاب میرے کپڑوں اور بدن پر گر جاتا ہے تو کیا اس صورت میں دوبارہ غسل کرنے اور کپڑے بدلنے ضروری ہیں؟ ﴿ڈاکٹر بشری۔ گلستان جوہر﴾

جواب:

بدن کے جس حصے پر اور کپڑے پر جہاں بچی کا پیشاب لگا ہے، وہ ناپاک ہو جاتے ہیں، بس انہیں دھو ڈالیں، نہ دوبارہ غسل کی ضرورت ہے نہ اس سے وضو ٹوٹتا ہے۔

خواتین کا ایام مخصوص میں مہندی لگانا

سوال:

کیا خواتین ایام مخصوص میں مہندی لگا سکتی ہیں اور اگر لگا دی جائے تو ایام گزرنے پر غسل کر کے پاک ہو سکتی ہیں؟
﴿لبنی رشید، سیماڑی، کراچی﴾

جواب:

جی ہاں، خواتین ایام مخصوص میں مہندی لگا سکتی ہیں، اپنے ہاتھ پاؤں پر یا بالوں پر، اور ایام گزرنے پر جب وہ غسل کریں گی تو پاک ہو جائیں گی۔

گلی کوچوں کے ناپاک پانی کا بدن یا کپڑوں پر لگنا

سوال:

ہم جب گھروں سے نکلتے ہیں تو اکثر گلی کوچوں میں پانی جمع رہتا ہے اور وہ بدن یا کپڑوں پر لگ جاتا ہے، کیا اس کا ازالہ متاثرہ جگہ کے دھولینے سے ہو جاتا ہے، یا وضو یا غسل کرنا پڑے گا؟
﴿سید محمد عارف۔ شاہ فیصل کالونی، کراچی﴾

جواب:

عام طور پر یہ یقین یا ظن غالب ہوتا ہے کہ یہ پانی گٹر کا ہے جو سیوریج لائن کے بند ہونے یا کسی لائن یا مین ہول کے ٹوٹ جانے سے ابلنے لگتا ہے اور گلی کوچوں میں پھیل جاتا ہے، یہ پانی ناپاک ہے اور بدن یا کپڑے کے جس حصے پر لگے، اسے اچھی طرح سے دھو ڈالیں۔ اس کے ازالے کے لئے غسل یا وضو کی ضرورت نہیں، اگر آپ پہلے سے با وضو ہیں تو آپ کا وضو بدستور قائم رہے گا۔

﴿کتاب الصَّلَاة﴾

مسجد میں داخل ہوتے وقت اونچی آواز سے سلام کرنا

سوال:

آج کل لوگ مسجد میں داخل ہوتے ہوئے بلند آواز سے سلام کرتے ہیں، جس سے نماز واذکار میں مشغول نمازیوں کا خیال بٹ جاتا ہے اور بعض نمازی بیٹھے ہوئے نمازیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں اور بعض نمازی آپس میں گفتگو کرتے ہیں، بعض دفعہ وہ گفتگو تفریح و مذاق کا رخ اختیار کر جاتی ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں جواب عنایت فرمائیں کہ اس طرح کے معمولات مسجد میں جائز ہیں یا نہیں۔ ﴿قاری محمد صدیق قادری، خطیب جامع مسجد خلفائے راشدین، گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

(۱) عن عبد الله بن عمرو ان رجلا سال رسول الله ﷺ: اى الاسلام خير؟ قال: تطعم الطعام و تقرئ السلام على من عرفت و من لم تعرف۔ ﴿مشکوٰۃ، باب السلام ص ۳۹۷﴾

”حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ اسلام کی کون سی خصلت سب سے اچھی ہے؟ آپ نے فرمایا: ”تم (مساکین کو) کھانا کھلاؤ اور (ہر مسلمان کو) سلام کرو، خواہ تم اسے جانتے ہو یا نہیں۔“

(۲) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ: للمؤمن على المؤمن ست خصال يعودہ اذا مرض و يشہدہ اذا مات و یجیبہ اذا دعاه و یسلم علیہ اذا لقیہ و یشمتہ اذا عطس و ینصح لہ اذا غاب او شہد لم اجدہ۔

﴿مشکوٰۃ، باب السلام، صفحہ ۳۹۷﴾

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک مومن کے دوسرے مومن پر چھ (عمومی) حقوق ہیں، جب وہ بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے، جب وہ وفات پائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو، جب وہ دعوت دے تو اسے قبول کرے، جب اس سے ملاقات ہو تو اسے سلام کرے، جب اسے چھینک آئے تو (اس کی الحمد للہ کے جواب میں) ”یَرْحَمُكَ اللَّهُ“ کہے اور وہ موجود ہو یا نہ ہو (ہر حال میں) اس کی خیر خواہی کرے۔“

(۳) عن ابی أمامۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ان اولی الناس باللہ من بدأ بالسلام۔

﴿مشکوٰۃ باب السلام صفحہ ۳۹۸﴾

”حضرت ابو امامہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عام لوگوں کے بہ نسبت اللہ تعالیٰ (کی رحمت و مغفرت) کا سب سے زیادہ حق دار وہ ہے جو سلام کی ابتدا کرے۔“

(۴) عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: یسلم الراكب على الماشی والماشی على القاعد والقلیل على الكثير
”حضرت ابو ہریرہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سوار پیدل کو سلام کرے، پیدل چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور جو تعداد میں کم ہوں وہ اپنے بہ نسبت زیادہ تعداد والوں کو سلام کریں۔“

(۵) عن ابی ہریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: یسلم الصغير على الكبير والمار على القاعد والقلیل على الكثير۔

﴿مشکوٰۃ باب السلام﴾

”حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوٹا بڑے کو سلام کرے، (راستے پر) چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے اور تھوڑے زیادہ کو سلام کریں۔“

(۶) عن ابی ہریرۃ عن رسول اللہ ﷺ قال: اذا اتی احدکم الى مجلس فلیسلم فان بداله ان یجلس فلیجلس ثم

اذا قام فلیسلم فلیست الاولى باحق من الآخرة۔ ﴿مشکوٰۃ باب السلام﴾

”حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی کسی مجلس میں پہنچے تو سلام کرے، اگر وہ بیٹھنا مناسب سمجھے تو بیٹھ جائے، پھر جب مجلس سے (روانہ ہونے کے لیے) اٹھے تو تب بھی سلام کرے کیونکہ پہلا دوسرے سے کوئی زیادہ اہم نہیں ہے، (یعنی اسلامی شعار ہونے کے اعتبار سے دونوں کی یکساں اہمیت ہے)۔“

ان احادیث مبارکہ سے معلوم ہوا کہ ”سلام“ اسلام کا شعار ہے، سنت متواترہ ہے، اسلامی اخلاقیات کا اعلیٰ نمونہ ہے، دنیا کی ہر قوم میں باہمی ملاقات کے موقع پر تحیت کے کچھ خاص کلمات رائج ہیں، جیسے انگریزوں کے ہاں گڈ مارنگ، گڈ نائٹ وغیرہ، فارسی میں صبح بہ بخیر، شب بخیر وغیرہ۔ لیکن اسلام کا شعار ملاقات والوداع سب سے منفرد ہے، یہ ایک جامع کلمہ دعاء و خیر خواہی ہے، اللہ کی سلامتی و رحمت و برکت کی دعا ہے اور اپنی جانب سے بھی پیغام سلامتی ہے۔ ایک حدیث مبارکہ میں آپ نے پڑھ لیا کہ آدمی باہر سے آ کر مجلس میں شریک ہو تو سلام کرے، اٹھ کر جانے لگے تو سلام کرے، اگرچہ اہل مجلس میں سے ہر ایک پر اس کے سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے ایک یا چند افراد نے جواب دے دیا تو جواب کی ”سنت کفایہ“ ادا ہوگئی۔

لیکن اگر مسجد میں لوگ نماز میں مشغول ہیں، تلاوت قرآن کریم، تسبیح، اوراد و وظائف اور درود شریف پڑھنے میں مشغول ہیں یا وعظ و تذکیر اور درس و تدریس کی مجلس میں مشغول ہیں تو پھر آنے والا اونچی آواز سے سلام نہ کرے (اور اگر اس نے اونچی آواز سے سلام کر بھی دیا تو ان لوگوں پر سلام کا جواب دینا واجب نہیں ہے) بلکہ وہ خاموشی سے آئے اور اپنی عبادت میں مشغول ہو جائے، ہاں اگر کوئی شخص

یا چند اشخاص کسی عبادت، تلاوت، اور ادا و اذکار وغیرہ میں مشغول نہیں ہیں تو ان کے قریب جا کر انہیں سلام کرے، تاکہ جو لوگ مصروف عبادت ہیں ان کی توجہ اور یکسوئی میں خلل واقع نہ ہو۔ یہ مسئلہ مسجد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ خارج مسجد بھی کوئی مجلس وعظ، تلاوت، درود خوانی یا ذکر و فکر کی مجلس برپا ہو تو جا کر خاموشی سے بیٹھ جائے۔ جہاں سلام کی اجازت ہے وہاں مصافحہ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی کھانا کھانے میں مشغول ہو تو بھی اسے سلام نہ کرے۔ لیکن اگر اسے کسی نے سلام کر دیا تو وہ جواب دے دے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے کھانے کے دوران بات چیت کا جواز ثابت ہے۔ البتہ اگر بھوک ہو اور کھانے کی طلب ہو تو سلام عرض کر دیں، شاید وہ پیش کش کرے۔

مسجد میں شور و غوغا کرنا، دنیوی باتیں کرنا، گپ شپ کرنا، ہنسی مذاق کی باتیں کرنا، کاروباری لین دین کی باتیں کرنا سخت منع ہے۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ : من سمع رجلاً ینشد ضالۃ فی المسجد فلیقل لارہا اللہ علیک فان المساجد لم تُبنَ لهذا۔

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کسی شخص کو مسجد میں گمشدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے تو کہے کہ اللہ کرے تجھے یہ چیز نہ ملے کیونکہ مساجد اس مقصد کے لیے نہیں بنائی گئیں۔“

(۲) عن عمرو بن شعیب عن ابيه عن جده قال نهى رسول الله ﷺ عن تناسد الاشعار في المسجد و عن البيع والاشتراء فيه وان يتحلق الناس يوم الجمعة قبل الصلوة في المسجد۔

”عمرو بن شعیب اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مساجد میں (نخس) اشعار پڑھنے، خرید و فروخت کرنے اور جمعہ کے دن مسجد میں نماز جمعہ سے پہلے حلقے بنا کر بیٹھنے سے منع فرمایا۔“

(۳) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول اللہ ﷺ : اذا رايتم من يبيع او يبتاع في المسجد فقولوا لا اربح الله تجارتك و اذا رايتم من ینشد فيه ضالۃ فقولوا لارہا اللہ علیک۔ ﴿مشکوٰۃ، باب المساجد﴾

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم دیکھو کہ کوئی شخص مسجد میں لین دین کر رہا ہے تو کہو کہ اللہ تمہاری تجارت میں نفع نہ دے اور جب تم دیکھو کہ کوئی گمشدہ چیز کا اعلان کر رہا ہے تو کہو کہ اللہ تعالیٰ یہ گمشدہ چیز تمہیں نہ لوٹائے۔“

(۴) عن الحسن مرسلًا قال قال رسول الله ﷺ : يا تي على الناس زمان يكون حديثهم في مساجد في امر دنياهم فلا تجالسوهم فليس لله فيهم حاجة۔ ﴿مشکوٰۃ، باب المساجد﴾

”حضرت حسن سے ایک حدیث مرسل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ وہ مساجد میں دنیوی باتیں کریں گے ان کے ساتھ نہ بیٹھو، اللہ کو ان (کی عبادت) سے کوئی غرض نہیں۔“

علامہ ابن عابدین شامی مسجد میں باتیں کرنے کی ممانعت کو منکرات یا ”لہو الخریث“ (بیہودہ یا بے مقصد باتوں) پر محمول کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”المصطفیٰ میں ہے مسجد میں بات چیت کے لیے بیٹھنا شرعاً جائز ہے کیونکہ اہل صفہ کا رہن سہن مسجد ہی میں ہوتا تھا وہاں پر سوتے بھی تھے اور بات چیت بھی کرتے تھے، لہذا کسی کے لیے اس سے منع کرنا جائز نہیں ہے۔“ (الجامع البرہانی) میں بھی اسی طرح ہے۔“

﴿فتاویٰ شامی ۳۷۸/۲ طبع جدید بیروت﴾

لیکن ظاہر ہے کہ اہل صفہ زیادہ تر دین ہی کی باتیں کرتے تھے، احادیث کا بیان کرتے تھے یا یہ اس طرح کی ضروری باتوں پر محمول ہے جیسے کسی مسجد کی انتظامیہ کے لوگ مسجد میں بیٹھ کر مسجد کے انتظامی معاملات پر بات کرتے ہیں یا کچھ لوگ کسی دینی، ملی اور فلاحی مسئلے پر بات کرتے ہیں۔ زیادہ احتیاط اس میں ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت نفلی اعتکاف کی نیت کر لینی چاہئے۔

گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں نماز کا تذکرہ

سوال:

کہا جاتا ہے کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ہمارے رسول اکرم ﷺ اور آپ کی امت پر معراج کی شب فرض ہوئی، جبکہ عمومی طور پر نماز کا تذکرہ گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات میں بھی ملتا ہے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سابق انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتوں میں کون کون سے اوقات کی نمازیں فرض تھیں، تحریر فرمائیے۔

﴿زابد اللہ۔ اوگی، مانسہرہ﴾

جواب:

قرآنی ارشادات کے مطابق تمام نبی اپنی امتوں کو نماز کی تعلیم دیتے رہے ہیں، انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو نماز پڑھائی بھی ہے اور پڑھی بھی ہے، حضرت ابراہیم فرماتے ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي۔ ﴿ابراہیم: ۴۰﴾

”اے میرے رب! مجھے نماز قائم کرنے والا بنا اور میری اولاد سے (بھی)۔“

قرآن میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا:

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ۔ ﴿مریم: ۵۵﴾

”وہ اپنے اہل و عیال کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔“

حضرت لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يُنِنِ أَقِمِ الصَّلَاةَ۔ ﴿لقمان: ۱۷﴾

”اے میرے بیٹے نماز پڑھو۔“

اللہ جل شانہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرماتا ہے:

أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي ۝ ﴿طہ: ۱۴﴾

”میری یاد (کو تازہ رکھنے) کے لئے نماز پڑھو۔“

بنی اسرائیل کو حکم ہوا:

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ۔ ﴿البقرة: ۴۳﴾

”اور نماز قائم کرو۔“

قرآن مجید حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَأَوْصِنِي بِالصَّلَاةِ۔ ﴿مریم: ۳۱﴾

”اور (اللہ تعالیٰ نے) مجھے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔“

امام نسائی اپنی سند کے ساتھ واقعہ معراج بیان کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں: ”(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا) پھر میں پانچ نمازوں (کا حکم لے کر) لوٹا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا: جائیے! اپنے رب سے مزید تخفیف کی گزارش کیجئے، کیونکہ بنی اسرائیل پر صرف دو نمازیں فرض کی گئی تھیں، لیکن وہ ان کو بھی نہ پڑھ سکے۔“

﴿سنن نسائی جلد ۱ ص ۵۲﴾

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر (یعنی شریعت موسیٰ علیہ السلام میں) دو نمازیں فرض تھیں۔

اس کے علاوہ ایک اور روایت میں ہے کہ نمازِ عشاء ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت کی خصوصیت ہے، چنانچہ امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اس نماز (عشاء) کو تاخیر سے پڑھا کرو کیونکہ تم کو اس نماز کے سبب کچھلی تمام امتوں پر فضیلت دی گئی ہے اور تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی۔“

﴿سنن ابوداؤد ج ۱ ص ۶۱﴾

ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ پنجگانہ نمازوں میں ہر ایک نماز کسی نہ کسی اولوالعزم نبی نے پڑھی ہے، گویا ہمارے نبی کریم ﷺ کی شریعت میں سب کو جمع کر دیا گیا ہے، چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ: ”حضرت آدم علیہ السلام نے صبح کی نماز پڑھی، حضرت داؤد علیہ السلام نے ظہر کی نماز پڑھی، حضرت سلیمان علیہ السلام نے عصر کی نماز پڑھی، حضرت یعقوب علیہ السلام نے مغرب کی نماز پڑھی اور حضرت یونس علیہ السلام نے عشاء کی نماز پڑھی۔“

﴿الاصباہ ج ۴ ص ۳۶۴ بحوالہ علامہ حلبی رافعی شارح مسند شافعی﴾

اس روایت کی رو سے امت محمدیہ سے پہلے عشاء کی نماز حضرت یونس علیہ السلام نے پڑھی ہے، لیکن گزشتہ روایت کی رو سے ان کی یا کسی اور نبی کی امت نے نہیں پڑھی۔

جہاں تک پانچ اوقات کی نماز کی فرضیت کا تعلق ہے، وہ تو شب معراج ہی کو فرض ہوئی ہے، لیکن فی نفسہ نماز نزول وحی کے ساتھ ہی فرض ہوگئی تھی۔ السیرۃ النبویہ لابن ہشام بر حاشیہ روض الانف ج ۱ ص ۱۶۲، اور انسان العیون ج ۱ ص ۴۲۶ میں ہے کہ جبریل امین نے وضو کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے وضو فرمایا، پھر آپ نے جبریل علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی۔ امام احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ نے شرح الزرقانی علی المواہب، المقصد الخامس فی المعراج والاسراء ۱۴۲/۶ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بنی اسرائیل پر دو وقت کی نماز فرض تھی، دو رکعت صبح اور دو رکعت رات کی، اور بعض کے نزدیک دو رکعت زوال کی بھی تھیں، لیکن وہ اس پر کاربند نہ رہ سکے۔ ﴿فتاویٰ رضویہ ۴۴/۵﴾ مطبوعہ رضافاؤنڈیشن

رہا یہ سوال کہ انبیاء سابقین کی نمازوں کا طریق اداء کیا تھا، یہ جاننا نہ ہماری ضرورت ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں اور نہ ہی قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں ان کی تفصیلات مذکور ہیں۔

تائب کی امامت کا حکم

سوال:

ایک شخص کچھ عرصہ پہلے گانے، ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں دیکھتا تھا اور اس نے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا** (ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی طرف صاف دل سے خالص توبہ کرو) کے مطابق توبہ کر لی، کیا ایسا شخص امامت کے قابل ہے، جبکہ اس میں اہلیت امامت کی تمام شرائط موجود ہیں، کیا اس پر کوئی حد شرعی قائم ہوگی۔ ﴿شاہد جمیل۔ گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

موسیقی کے ساتھ فحش گانے، بیہودہ ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں دیکھنا گناہ ہے۔ صورتِ مسئلہ میں جب اس شخص نے صدق دل سے توبہ کر لی ہے تو وہ امامت کے قابل ہے اور اس کی اقتداء میں نماز صحیح ہے۔ جب تک توبہ کے منافی اس سے فسق و فجور کا صدور نہ ہو تو اس کے ماضی کے کردار کے حوالے سے بدگمانی ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ۔ ﴿الحجرات: ۱۲﴾

”اے ایمان والو! بہت سے گمان سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔“

اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: بدگمانیوں سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و صحیح مسلم﴾

توبۃ النصوح اور توبۂ صادق کی ظاہری علامت یہ ہے کہ بندے نے جس گناہ سے توبہ کی ہے، دوبارہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کریمی سے توبہ کی قبولیت کا وعدہ فرمایا ہے اور اسے اپنے ذمہ کرم پر لیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ الشُّوْءَ بِحَظَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ط وَكَانَ اللَّهُ

﴿النساء: ۱۷﴾

عَلِيمًا حَكِيمًا

”وہ توبہ جس (کی قبولیت) کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو نادانی کی وجہ سے گناہ کر بیٹھیں، پھر جلدی سے توبہ کر لیں تو وہ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت سے رجوع فرماتا ہے، اور اللہ خوب جاننے والا بہت حکمت والا ہے۔“
اور رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں۔“

﴿مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابن ماجہ و سنن بیہقی﴾

سوال میں مذکور شخص پر کوئی حد شرعی عائد نہیں ہوتی۔ عامۃ المسلمین سے بھی گزارش ہے کہ اگرچہ شرعاً تصویر کا حکم اصل کا نہیں ہوتا، لیکن موسیقی اور گانے بجانے کے آلات کے ساتھ فحش گانے سننا، بیہودہ ڈرامے اور بے حیائی کی فلمیں اور ناچ گانے کے پروگرام دیکھنا مکروہ تحریمی ہے اور اس سے اجتناب کرنا چاہئے اور کسی تھیٹر وغیرہ میں جا کر غیر محرم عورتوں کو براہ راست بے حجاب اور نیم عریاں لباس میں دیکھنا بھی مکروہ تحریمی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”بے شک شیطان انسان (کی رگ و پے) میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے جیسے (رگوں میں) خون رواں ہے۔“
﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیحین﴾

اور فرمان رسول ﷺ ہے: ”آنکھوں کا زنا (غیر محرمات کو بے حجاب) دیکھنا ہے، اور کانوں کا زنا (فحش باتیں) سننا ہے، اور زبان کا زنا (بے حیائی کی) باتیں کرنا ہے، اور ہاتھ کا زنا چھونا ہے اور پاؤں کا زنا (برائی کی طرف) قدم اٹھانا اور دل (گناہ کی) خواہش اور آرزو کرتا ہے اور شرم گاہ (گناہ سے رک کر) اس کی تکذیب کرتی ہے یا (گناہ میں مبتلا ہو کر) اس کی تصدیق کرتی ہے، (مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم)۔“ یعنی مومن کو گناہ کے مبادیات اور محرکات سے بچنا چاہئے ورنہ گناہ میں مبتلا ہونے کا ہر وقت اندیشہ ہے۔

امام کا صفیں درست کرنے کی ہدایت کرنا

سوال:

سوال یہ ہے کہ بندہ نے اب تک جہاں بھی نماز جمعہ ادا کی ہے۔ ائمہ کرام یہ بات ضرور کہتے ہیں کہ صفیں سیدھی کر لیں اور ساتھ کوئی اور جملہ بھی کہہ دیتے ہیں آیا اس کا کوئی شرعی جواز ہے؟ اگر ہے تو مفصل جواب دیں۔ مہربانی ہوگی۔ ہاں آیا امام صاحب نماز کی امامت پہ بھی یہ الفاظ دہرا سکتا ہے یا کہ نہیں؟
﴿ارشاد علی، پنجاب﴾

جواب:

رسول اللہ ﷺ نے باجماعت نماز میں صفوں کی درستی پر بہت زور دیا ہے، تاکید فرمائی ہے اور صفوں میں خلا چھوڑنے اور صفیں ٹیڑھی بنانے پر وعید بھی فرمائی ہے، آپ کا ارشاد ہے: ”اللہ کے بندو! تمہیں لازماً صفیں سیدھی رکھنی چاہئیں، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو بگاڑ دے گا (یا انہیں پھیر دے گا) یا ان میں اختلاف پیدا فرما دے گا۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم﴾

اور آپ نے ارشاد فرمایا: ”صفوں کو (سیدھا اور) برابر رکھو، کیونکہ صفوں کی درستی سے نماز کی تکمیل ہوتی ہے۔“ ﴿مشکوٰۃ﴾
 ”ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (نماز کے وقت) ہمارے کندھوں کی چھو کر صفوں کو درست کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے: صفیں برابر رکھو اور ان میں بگاڑ پیدا نہ کرو ورنہ تمہارے دلوں میں بگاڑ (اور نفاق) پیدا ہوگا، تم میں جو زیادہ سمجھدار ہیں وہ میرے قریب کھڑے ہوں، اور اس کے بعد دوسرے درجہ بدرجہ۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم﴾

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نماز کی اقامت کہی گئی، پھر رسول اللہ ﷺ ہماری جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا: صفوں کو سیدھا کرو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھڑے ہوا کرو، کیونکہ میں (دوران نماز) اپنی پیٹھ کے پیچھے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جیسے کہ سامنے دیکھتا ہوں، (مشکوٰۃ)۔“ اسی طرح مشکوٰۃ شریف میں متعدد روایات درج ہیں، جن کی رو سے آپ ﷺ صفوں کی درستی کے لئے یہ کلمات ارشاد فرماتے تھے: ”سَوُّوْا، اِسْتَوُّوْا، اِعْتَدِلُوْا (یعنی صفوں کو برابر کرو، سیدھا کرو، ٹھیک کرو)۔“ اور آپ فرماتے تھے: ”صفوں کو سیدھا کرو، کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو (یعنی آگے پیچھے نہ کرو)، اور صفوں میں (دو آدمیوں کے درمیان) خلا نہ چھوڑو، کیونکہ اس میں شیطان گھس جاتا ہے (اور تمہارے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، بگاڑ پیدا کرتا ہے)۔“

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صفیں سیدھی رکھو، کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو، صفوں میں (دو آدمیوں کے درمیان) خالی جگہ نہ چھوڑو، (صفیں سیدھی کرنے کے لئے) تمہارا دینی ہاتھ بڑھائے تو اس کے ساتھ نرمی اختیار کرو، شیطان کے لئے بیچ میں کشادہ جگہ نہ چھوڑو، جو صف کو ملا کر رکھے گا، اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت سے وابستہ رکھے گا اور جو صف کا سلسلہ توڑ دے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کا رشتہ توڑ دے گا۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد و نسائی﴾

ان احادیث مبارکہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ صفوں کی درستگی کا کتنا اہتمام اور تاکید فرماتے تھے اور آپ نے صفوں کو برابر نہ رکھنے والوں کے لئے کتنی شدید وعیدیں فرمائیں۔ عہد رسالت مآب ﷺ اور عہد خلفاء راشدین و سلف صالحین میں یہ تاکید شدید اس لئے بھی تھی کہ مساجد ناپختہ تھیں، صفوں کی نشاندہی کے لئے لائنوں، دریوں، چٹائیوں اور قالینوں کا اہتمام نہیں تھا، لہذا صفوں کی درستی کے لئے انتہائی توجہ کی ضرورت تھی۔ آج کل ہمارے لئے بڑی آسانیاں ہیں، اگر کسی مسجد میں نمازی کم ہیں یا مسجد بالکل چھوٹی ہے اور امام سمجھتا ہے کہ صفیں درست بن رہی ہیں تو اگر زبانی تاکید نہ بھی کرے تو حرج نہیں ہے، لیکن اگر تاکید صفوف کو سنت رسول اللہ ﷺ سمجھتے

ہوئے زبانی بھی کہہ دے تو تعمیل سنت کا اجر ملے گا۔ مسجد بڑی ہو، نمازی زیادہ ہوں تو بہتر یہی ہے کہ امام تاکیداً صفیں درست کرائے، امام اگر ضرورت محسوس کرے تو اقامت مکمل ہونے کے بعد نمازیوں کو صفوں کی درستی کے لئے مزید وقت دے سکتا ہے اور اس مقصد کے لئے تکبیر تحریرہ میں چند لمحے کی تاخیر بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اَوَابین کے نوافل پڑھنے کا طریقہ

سوال:

”اَوَابین“ کے نوافل پڑھنے کا کیا طریقہ ہے؟ کیا یہ نوافل نماز مغرب کے ساتھ ملا کر پڑھے جاتے ہیں؟ اور کیا نفلی عبادت کے بعد دعا مانگنی چاہئے؟ ﴿محمد سلیم، فیڈرل بی ایریا، کراچی﴾

جواب:

”اَوَاب“ کے لفظی معنی ہیں ”توبہ کرنے والا“، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ”طلب مغفرت کے لئے رجوع کرنے والا“۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا فِي نُفُوسِكُمْ ۖ إِنَّ تَكُونُوا صَالِحِينَ فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَابِينَ غَفُورًا ۝ ﴿بنی اسرائیل: ۲۵﴾

”تمہارا رب خوب جانتا ہے، جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، اگر تم نیک ہوئے تو بلاشبہ وہ ان لوگوں کو بہت بخشنے والا ہے جو اس کی طرف رجوع کرنے والے (اَوَابین) ہیں۔“

مغرب کی نماز کے بعد کم از کم چھ رکعات نوافل پڑھنا مستحب ہے، ان کو ”اَوَابین“ کہتے ہیں، یہ نماز دو دو رکعت کر کے تین سلام کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، یعنی ہر دو رکعت پر سلام پھیرے۔ مغرب کے فرض کے بعد دو رکعت سنت مؤکدہ اَوَابین کے نوافل کے ساتھ ملا کر پڑھ سکتے ہیں، ان نوافل میں مطلق نماز کی نیت کافی ہے، یعنی نیت میں اَوَابین کا لفظاً ذکر یا ذہن میں اس مفہوم کا استحضار (Presence) ضروری نہیں ہے اور سنت کی نیت سے بھی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ یہ سنن زوائد میں سے ہیں۔ اَوَابین کی کم از کم چھ رکعات ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ایک اور روایت کے مطابق ان کی تعداد بیس رکعات ہے۔ ﴿ترمذی ج ۱ ص ۵۸ باب ما جاء في فضل التطوع ست ركعات﴾ نفل نماز کے بعد دعا مانگی جاسکتی ہے، دعا مانگنا افضل ہے اور اس کے لئے کسی وقت کی تحدید نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ۔ ﴿البقرة: ۱۷۶﴾

”میں دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھ سے دعا مانگے۔“

حدیث شریف کی معروف کتاب ”سنن ترمذی“ میں ہے:

عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ا: مَنْ صَلَّى بَعْدَ الْمَغْرَبِ سِتَّ رَكَعَاتٍ لَمْ يَتَكَلَّمْ فِيهَا بَيْنَهُنَّ

بِسُوءٍ عُذِلْنَ لَهُ، بِعِبَادَةِ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ سَنَةً۔ ﴿رقم الحديث: ۴۳۵﴾

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے نماز مغرب کے بعد چھ رکعات (نفل) اس طرح پڑھے کہ ان کے درمیان کوئی بری بات نہیں کی تو وہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) بارہ سال کی (نفلی) عبادت کے برابر ہوں گے۔“

اس حدیث کے تحت امام ابو عیسیٰ ترمذی لکھتے ہیں: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کی ایک روایت ہے کہ ”جس نے مغرب کے بعد بیس رکعات نفل پڑھے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر تعمیر فرمادے گا۔“ مغرب کے بعد کے چھ نوافل کی فضیلت کے بارے میں ”سنن ابن ماجہ“ میں دو مقامات پر الگ الگ عنوانات کے تحت یہ حدیث مذکور ہے (احادیث نمبر ۱۱۶، ۱۳۷۳) اور تحفۃ الاشراف میں حدیث نمبر ۱۵۴۱۲ کے تحت درج ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو غریب وضعیف قرار دیا ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث معتبر ہوتی ہیں۔

نماز میں سورت ملانا بھول گیا

سوال:

ایک شخص نے چار رکعت نماز سنت کی نیت کی، سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملانی بھول گیا اور رکوع میں چلا گیا، بعد میں یاد آیا کہ سورت ملانا رہ گئی ہے، کیا سجدہ سہو سے نماز ہو جائے گی؟

﴿حافظ محمد ارشاد۔ امام و خطیب جامع مسجد اللہ والی۔ لائسنس ایریا، صدر، کراچی﴾

جواب:

اگر فرض کی پہلی دو رکعات اور باقی کسی بھی نماز (وتر، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ، نفل) کی کسی بھی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملانا بھول جائے اور رکوع میں چلا جائے تو رکوع میں یاد آنے پر بھی پلٹ کر نہ آئے بلکہ نماز مکمل کرے اور آخر میں سجدہ سہو کر لے، نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی، کیونکہ سورت کا ملانا واجب ہے اور ترک واجب کی تلافی سجدہ سہو سے ہو جاتی ہے۔

نماز میں سہو کے مسائل

سوال:

اگر کوئی نمازی بھول کر رکوع یا سجود میں قرأت کر لے تو کیا اس سے سجدہ سہو لازم آئے گا؟

﴿آثار اللہ - قاری بختیار احمد - فیڈرل بی ایریا، کراچی﴾

جواب:

یہ مسئلہ ہمارے اکابر فقہاء کرام میں مختلف فیہ ہے۔ علامہ ابن عابدین شامی نے لکھا ہے:

قال المقدسی: وکما لو قرأ القرآن هنا أوفى الركوع يلزمه السهو مع انه كلام الله تعالى وکمالو ذکر التشهد فی

القیام مع انه توحید الله تعالى۔ ﴿فتاویٰ شامی، ج ۲ ص ۴۷۵ طبع جدید﴾

”مقدس نے کہا ہے کہ اسی طرح اگر یہاں (یعنی التیات کے بعد) یا رکوع میں قرآن پڑھا تو سجدہ سہو لازم ہوگا، حالانکہ یہ تو اللہ کا کلام ہے اور اسی طرح اگر قیام میں تشهد (یعنی التیات) پڑھی تو سجدہ سہو لازم آئے گا، حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار ہے۔“

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق مؤلفہ علامہ فخر الدین زلیعی ج ۱ ص ۱۹۳ پر ہے:

و کذا لو قرأ آية في الركوع أو السجود أو القومة أو القعود فعليه السهو لانه ليس بموضع القراءة۔

”اور اسی طرح اگر رکوع یا سجود یا قومہ (رکوع سے اٹھنے کے بعد سجدے میں جانے سے پہلے جو ایک تسبیح کی مقدار رک کر قیام کرتے ہیں) یا قعود (یعنی التیات) میں ایک آیت پڑھی تو اس پر سجدہ سہو لازم ہے، کیونکہ یہ مقام قرأت نہیں ہے۔“

علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر شرح ہدایہ میں ج ۱ ص ۵۲۱ پر لکھا ہے:

”ولو قرأ التشهد في الركوع أو السجود لاسهو عليه لانه ثناء وهما محلان، بخلاف القراءة فيهما فان فيه

السهو۔“

”اگر نمازی نے رکوع و سجود میں التیات پڑھی تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے، کیونکہ یہ (التیات) ثناء ہے اور رکوع و سجود ثناء پڑھنے کا محل

ہے، اس کے برعکس اگر رکوع و سجود میں قرآن پڑھا تو اس پر سجدہ سہو لازم آئے گا (کیونکہ رکوع و سجود محل قرأت نہیں ہیں)۔“

علامہ زین الدین ابن نجیم، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ج ۲ ص ۹۷ پر لکھتے ہیں:

وقد اقتصر المصنف على هذه الواجبات في باب صفة الصلوة وبقی واجب آخر وهو عدم تأخير الفرض والواجب وعدم تغييرهما وعليه تفرع مسائل منها وكذا لو قرأ آية في الركوع او السجود والقومة فعليه السهو كما في الظهيرية وغيرها وعلمه في المحيط بتأخير ركن او واجب عليه۔“

”اور مصنف نے ”باب صفة الصلوة“ میں انہی واجبات کے بیان پر اکتفاء کیا ہے اور ایک اور واجب کا بیان رہ گیا ہے اور وہ ہے: فرض اور اور واجب میں تاخیر نہ کرنا اور ان میں تبدیلی نہ کرنا اور اس پر کئی مسائل متفرع ہوتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ: اور اسی طرح اگر اس نے رکوع یا سجدہ یا قومہ (یعنی رکوع کے بعد سجدہ میں جانے سے پہلے ایک تسبیح کی مقدار جو قیام ہوتا ہے) کی حالت میں ایک آیت پڑھ لی تو اس پر سجدہ سہو واجب ہے، جیسا کہ ظہر یہ وغیرہ میں ہے، محیط میں اس سجدہ سہو کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس قرأت سے رکن یا واجب میں تاخیر ہو جاتی ہے۔“

علامہ علاؤ الدین بن مسعود کا سانی بدائع الصنائع ج ۱ ص ۶۹۹ پر لکھتے ہیں:

ولو قرأ القرآن في ركوعه او في سجوده او في قيامه، لا سهو عليه، لانه ثناء و هذه الاركان مواضع الثناء۔
”اور اگر اس (نمازی) نے اپنے رکوع یا سجدہ یا قومہ میں قرآن پڑھا، تو اس پر سجدہ سہو واجب نہیں ہے، کیونکہ قرآن بھی اللہ کی ثناء ہے اور یہ ارکان (رکوع، سجود اور قومہ) بھی محل ثناء ہیں۔“

آپ نے اکابر فقہاء کرام کے اقوال ملاحظہ فرمائے، یہ سب ہمارے وہ عظیم اسلاف ہیں جن کی کتب سے نقل کر کے ہر مفتی فتویٰ دیتا ہے اور جتنے بھی اہل سنت و جماعت حنفی لوگ ہیں، بہ طیب خاطر ان پر عمل کرتے ہیں اور ان کو حجت مانتے ہیں، ان میں سے صرف علاؤ الدین کا سانی، رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے پر سجدہ سہو کے عدم وجوب کے قائل ہیں اور ان کی دلیل بھی معقول ہے۔ لیکن چونکہ باقی تمام فقہاء کرام، جن کے حوالہ جات اوپر دیئے گئے ہیں، رکوع و سجود اور قومہ میں قرآن پڑھنے پر سجدہ سہو کو واجب قرار دیتے ہیں، لہذا عامۃ المسلمین کو چاہئے کہ احتیاط پر عمل کریں اور ایسے موقع پر سجدہ سہو کریں۔

مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال:

فرض نماز میں جب امام قرأت شروع کر دے تو ثناء نہیں پڑھنی چاہئے جبکہ آپ نے سوال و جواب کے کالم میں فرمایا ہے کہ اگر نمازی کو گمان یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء حالت قیام میں پڑھ کر امام کو رکوع میں پالے گا تو ثناء پڑھ لے۔

﴿عبداللہ لائٹھی، کراچی﴾

جواب:

میں نے جو کچھ تحریر کیا تھا، وہ قرآن مجید کی اس آیت ربانی میں جو ارشاد باری تعالیٰ ہے، وہ اس کی تعمیل ہے:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ﴿۲۰۴﴾ (الاعراف: ۲۰۴)

”اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“

فقہاء احناف نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ فَاسْتَمِعُوا (یعنی توجہ سے سنو) پر عمل تب ہوگا جب امام جہری نماز (مغرب، عشاء اور فجر) میں اونچی آواز سے تلاوت کرتا ہے، اور جب امام سری نماز (یعنی ظہر و عصر) میں آہستہ آواز سے تلاوت کرتا ہے تو مقتدی اَنْصِتُوا (خاموش رہو) پر عمل کر رہا ہے، اور جب امام کو رکوع یا سجدے کی حالت میں پائے، تو فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۹۱ پر ہے:

”اور اگر مقتدی امام کو رکوع میں پائے یا سجدے کی حالت میں، تو سوچے، اگر اس کا غالب گمان یہ ہو کہ اگر وہ ثناء پڑھے گا تو امام کو اس رکوع یا سجدے میں پالے گا، تو حالت قیام میں ثناء پڑھ کر امام کے ساتھ شامل ہو جائے، ورنہ (یعنی اگر اس کا غالب گمان یہ ہے کہ اس کے ثناء پڑھنے سے امام رکوع یا سجدے سے اٹھ جائے گا تو) ثناء وتعوذ (اعوذ باللہ) نہ پڑھے، اور اگر مقتدی امام کو قعدے میں پائے تو ثناء نہ پڑھے بلکہ تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد دوسری تکبیر (تکبیر انتقال) کہہ کر قعدے میں چلا جائے، (البحر الرائق میں ”باب فی صفۃ الصلوۃ“ کے تحت یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے)۔

اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جائے تو کیا حکم ہے؟

سوال:

اگر اذان کے کلمات میں غلطی ہو جائے یا کوئی کلمہ رہ جائے، مثلاً ”حَسْبِيَ عَلَى الصَّلَاةِ“ تو اذان کا اعادہ ضروری ہے یا نہیں، نیز اقامت میں اگر کلمہ ”قَدْ قَامَتِ الصَّلَاةُ“ رہ جائے تو اقامت کا اعادہ بھی ضروری ہے یا نہیں، اگر اسی اقامت سے نماز پڑھالی، آیا نماز ہو جائے گی یا نہیں؟ وضاحت فرمائیے۔

﴿حافظ آثار اللہ، مانسہرہ﴾

جواب:

اذان یا اقامت میں کوئی کلمہ رہ جانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کوئی کلمہ رہ جائے اور اذان یا اقامت کے دوران میں ہی یاد آ گیا، تو اس کا حکم یہ ہے کہ جہاں سے کوئی کلمہ چھوٹا ہے، پلٹ کر وہاں سے دوبارہ ترتیب کے مطابق سارے کلمات ادا کر کے اذان یا اقامت کو مکمل کرے۔ علامہ علاؤ الدین بن مسعود کا سانی حنفی لکھتے ہیں: ”(ترجمہ) ان مسائل اذان و اقامت میں سے ایک یہ ہے کہ کلمات اذان و اقامت کو ترتیب کے مطابق پڑھے، یہاں تک اگر کسی کلمے کو دوسرے کلمے پر مقدم کر کے پڑھ لیا تو پھر ترتیب کے مطابق

کلمات کو ملا کر پڑھے اور جو کلمہ بھول کر پہلے پڑھ چکا تھا، اسے دوبارہ ترتیب کے مطابق اپنے مقام پر پڑھے۔“

﴿بدائع الصنائع ج ۱ ص ۶۴۳﴾

اذان یا اقامت کا کلمہ رہ جانے کی دوسری صورت یہ ہے کہ درمیان میں سے کوئی کلمہ بھولے سے رہ گیا اور دوران اذان و اقامت یاد نہ آیا، بلکہ اذان و اقامت کے اختتام کے بعد خود یاد آیا یا کسی نے یاد دلایا تو اب اذان یا اقامت کا اعادہ ضروری نہیں ہے، (لیکن کرنا افضل ہے) کیونکہ اذان و اقامت کا مقصد نماز کا اعلان کرنا ہے اور وہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اور اعادے کے بغیر بھی نماز کی صحت یا نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ علامہ شیخ نظام الدین لکھتے ہیں: ”اگر مؤذن اپنی اذان یا اقامت میں کسی کلمے کو خلاف ترتیب دوسرے کلمے پر مقدم کر دے، جیسے اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ كُوْا شَهِدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے پہلے پڑھ لے، تو بہتر صورت تو یہ ہے کہ جو کلمہ خلاف ترتیب پہلے پڑھ لیا گیا ہے، اس کا اعتبار نہ کرے اور دوبارہ ترتیب کے مطابق وہاں سے پڑھے جہاں سے کوئی کلمہ رہ گیا ہے، اور اگر بھولے سے چھوڑے ہوئے کلمہ کا اعادہ کر کے ترتیب کے مطابق اذان کی تکمیل نہ کی، بلکہ ویسے ہی مکمل کر لی تو نماز جائز ہوگی۔“

﴿فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۵۶﴾

علامہ کمال الدین ابن ہمام لکھتے ہیں: ”اور اذان کے دو کلمات کے درمیان فصل (یعنی سکتہ) نہ کرے بلکہ روانی سے پڑھے تاکہ وہ ایک مسلسل کلام معلوم ہو، اور اقامت کہتے وقت اپنی آواز کو اذان کے بہ نسبت ذرا پست رکھے، اور کلمات اذان و اقامت، جیسے کہ شریعت میں وارد ہوئے ہیں اسی ترتیب کے مطابق پڑھے، اگر بعض کلمات میں ترتیب شرعی کے خلاف تقدیم و تاخیر ہوگئی ہو، تو رعایت ترتیب کے لئے اعادہ سنت ہے۔“

﴿فتح القدیر شرح ہدایہ ج ۱ ص ۲۴۸﴾

امام مقدار واجب تلاوت کر لے اور اس کے بعد اس سے غلطی ہو جائے تو مقتدی لقمہ دے سکتا ہے؟

سوال:

امام نے بقدر واجب تلاوت کر لی اور اس کے بعد تلاوت جاری تھی کہ امام سے غلطی ہوگئی، مقتدی امام کو بتائے یا نہیں، اگر مقتدی نے بتایا تو اس کی نماز فاسد تو نہیں ہوگی، اسی طرح امام کے لقمہ لینے سے امام کی نماز بھی فاسد تو نہیں ہوگی؟ ﴿زاهد اللہ۔ لائڈھی، کراچی﴾

جواب:

اصولی طور پر تو مقتدی کو بلا ضرورت لقمہ نہیں دینا چاہئے، ورنہ بلا ضرورت لقمہ دینے سے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور امام کے لقمہ لینے سے اس کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی، لیکن قرأت کا مسئلہ اس ضابطے سے مستثنیٰ ہے، لہذا اگر امام سورہ فاتحہ کے بعد قرأت مقدار

واجب سے زیادہ بھی پڑھ لے (یعنی ایک طویل آیت یا تین چھوٹی آیات) تو غلطی پر مقتدی لقمہ دے دے اور امام اس کا لقمہ لے سکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں ”سورة المؤمنون“ کی تلاوت کی اور ایک کلمہ درمیان میں رہ گیا، نماز سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا: تم میں ابی ابن کعب نہیں تھے جو بتا دیتے، انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نے سمجھا: شاید یہ کلمہ منسوخ ہو گیا ہے، آپ نے فرمایا: اگر منسوخ ہوا ہوتا تو میں تمہیں بتا دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کی قرأت مقدار واجب سے طویل بھی ہو اور اس سے غلطی ہو جائے تو مقتدی کو بتا دینا چاہئے اور امام کو لقمہ لے لینا چاہئے۔

نماز کے بعد سر پر ہاتھ رکھ کر دعا کرنا

سوال:

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ فرض نماز کے بعد بعض لوگ سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھتے ہیں، کیا یہ طریقہ کار درست ہے؟ کیا احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے، یہ لوگ کیا پڑھتے ہیں؟ ﴿سید محمد علی۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی﴾

جواب:

علامہ محمد بن محمد جذری نے حصن الحصین میں طبرانی اور بزار کے حوالے سے مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے: ”حضرت انس بن مالک بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھ لیتے اور نماز سے فارغ ہو جاتے تو اپنا دایاں ہاتھ سر پر رکھ کر یہ دعا مانگتے تھے:

”بِسْمِ اللَّهِ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ، اللَّهُمَّ اذْهَبْ عَنِّي الْهَمَّ وَالْحُزْنَ“

ترجمہ: ”اللہ کے نام سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بہت مہربان نہایت رحم والا ہے، اے اللہ! (ازراہ کرم) تو مجھ سے ہر قسم کے رنج و الم اور غم کو دور فرما۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز فرض پڑھ کر فارغ ہو جاتے تو اپنا دایاں ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھ کر یہ دعا فرماتے:

”أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ، الْحَمْدُ لِلَّهِ اللَّهُمَّ اذْهَبْ عَنِّي الْهَمَّ وَالْحُزْنَ“

ترجمہ: ”میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ رحمان و رحیم ہے، تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اے اللہ! (ازراہ کرم) مجھ سے ہر قسم کے رنج و الم اور غم و اندوہ کو دور فرما۔“

مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو کیا کرے؟

سوال:

ایک نمازی مسجد میں داخل ہوا تو جماعت کھڑی تھی، اور امام رکوع میں تھا، اب وہ کیا کرے؟ تکبیر تحریمہ کہہ کر اور ہاتھ باندھنے کے بعد رکوع میں جائے یا بغیر ہاتھ باندھے ”اللہ اکبر“ کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے؟

﴿محمد انصر۔ دتگیر کالونی، کراچی﴾

جواب:

باہر سے آنے والا نمازی جب امام کو رکوع میں پائے تو سیدھا کھڑے ہو کر حالت قیام میں تکبیر تحریمہ کہے اور پھر تکبیر انتقال یعنی رکوع کے لئے اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے، ہاتھ باندھنے کی ضرورت نہیں، اگر اسے غالب گمان یہ ہو کہ اس کے ”سُبْحَنَكَ اللَّهُمَّ“ (یعنی ثناء) پڑھنے سے امام رکوع سے اٹھ جائے گا تو وہ ثناء نہ پڑھے اور رکوع میں چلا جائے۔ اگر عجلت یا بے خیالی میں تکبیر تحریمہ کے بعد رکوع کی تکبیر کہنا بھول گیا تو بھی نماز ادا ہو جائے گی کیونکہ تکبیر انتقال سنت ہے اور نسیاناً ترک سنت سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا اور نماز صحیح طور پر ادا ہو جاتی ہے۔ البتہ اگر تکبیر تحریمہ حالت قیام میں نہ کہی، بلکہ اتنا جھکتے ہوئے کہی کہ ہاتھ پھیلائیں تو گھٹنوں تک پہنچ جائیں تو نماز ادا نہیں ہوگی، لہذا احتیاط ضروری ہے۔ اگر نمازی کا گمان غالب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد ”سُبْحَنَكَ اللَّهُمَّ“ (یعنی ثناء) حالت قیام میں پڑھ کر امام کو رکوع میں پالے گا تو پھر ہاتھ باندھ کر ثناء پڑھ لے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلا جائے اور امام کے ساتھ شامل ہو جائے۔

غیر مسلم ملک میں نماز باجماعت، جمعہ اور روزے کا مسئلہ؟

سوال:

بہت سے لوگوں کو روزگار کے لئے غیر مسلم ممالک جانا پڑتا ہے، وہاں پر نماز باجماعت پنجگانہ، جمعہ اور روزے کے لئے کیا کرے؟

﴿سید عشرت۔ بفرزون، نار تھ کراچی﴾

جواب:

آج کل تقریباً ہر غیر مسلم ملک میں مساجد، اسلامک سینٹر، کمیونٹی سینٹر موجود ہیں، جہاں سے بہت سے معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ قریب ترین مسجد کہاں ہے؟ حلال اشیاء خوراک اور حلال گوشت کہاں سے ملتا ہے، وغیرہ۔ جہاں آپ کی

ملازمت یا روزگار ہے، اگر قریب کوئی مسجد یا اسلامی مرکز نہیں ہے تو تنہا نماز پڑھیں، اگر کسی ایک جگہ دو تین مسلمان بھائی کام کر رہے ہیں تو آپس میں مل کر جماعت کر لیا کریں، دو ہوں تو ایک امام بن جائے اور ایک مقتدی۔ اکیلے ہیں یا بد قسمتی سے دوسرے ساتھی نماز نہیں پڑھتے تو آپ سے جماعت کی مسؤلیت نہیں ہوگی۔ آپ کے قریب کوئی مسجد یا اسلامی مرکز نہیں ہے جہاں نماز جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے یا ہے مگر غیر مسلم ادارہ آپ کو چھٹی نہیں دیتا تو ظہر کی نماز پڑھ لیا کریں۔ روزے باقاعدہ رکھیں، صبح صادق اور غروب کے اوقات کسی قریب ترین اسلامک سینٹر سے معلوم کر لیں۔ غروب کا وقت تو ہر ملک میں اخبارات وغیرہ سے معلوم ہو جاتا ہے۔

ناپاکی کی حالت میں نماز پڑھنا

سوال:

میں کسی کے ہاں مہمان تھا، رات کو جنابت ہو گئی، غسل واجب ہو گیا، شرم کے مارے میزبانوں کو بتایا نہیں اور معمول کے مطابق وضو کر کے نماز پڑھ لی، اب کیا کروں؟ ﴿اولیس یا رافغانی۔ لائڈھی، کراچی﴾

جواب:

مشہور مقولہ ہے کہ ”شرع میں کوئی شرم کی بات نہیں ہے“ انسانی احوال و کیفیات کو سب جانتے ہیں، آپ کو اپنے میزبان کو بتا دینا چاہئے تھا کہ مجھے غسل کرنا ہے، سب سے زیادہ حیا تو بندے کو رب سے کرنا چاہئے۔ حالت جنابت میں نماز پڑھ کر آپ نے گناہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ سے صدق دل سے توبہ کریں اور اس نماز کی قضا بھی پڑھیں۔

بڑی مسجد کی تعریف

سوال:

آپ نے تفہیم المسائل میں لکھا ہے کہ بڑی مسجد میں نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں، بڑی مسجد کی تعریف کیا ہے؟ ﴿ابوالجہاد محمد عبدالرشید ہمایوں۔ گلستان جوہر، کراچی﴾

جواب:

میں نے مسئلہ یہ تحریر کیا تھا کہ ”مسجد صغیر“ میں نمازی کہیں بھی کھڑا ہو، دیوارِ محراب تک اس کے آگے سے گزرنا سترہ کے بغیر جائز نہیں ہے، البتہ ”مسجد کبیر“ یا کھلے میدان میں ایک محدود فاصلے کے بعد نمازی کے آگے سے گزر سکتے ہیں۔ یعنی یہ کہ حالت قیام میں

آدابِ نماز کے مطابق نمازی اپنے ”مقامِ سجدہ“ پر نظر جمائے رکھے تو آگے جتنی جگہ تک اس کی نظر پھیل سکتی ہے، وہاں تک نہیں گزر سکتے، اس کے آگے سے گزرنا جائز ہے۔

”مسجد کبیر“ کی تعبیر کے بارے میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں، مثلاً یہ کہ اس کا طول و عرض ۶۰ یا ۷۰ ذراع شرعی یعنی مروجہ ۲۰ یا ۳۰ میٹر سے کم نہ ہو۔ ہم آسانی اور سہولت کے لئے کم از کم مقدار پر فتویٰ دے سکتے ہیں، یعنی یہ کہ مسجد کا طول و عرض ۲۰ میٹر سے زیادہ ہو تو نمازی کے آگے سے تین صف کے بعد سترہ کے بغیر بھی گزر سکتے ہیں اور جو صاحبان احتیاط کرنا چاہیں وہ ۳۰ میٹر طول و عرض کو معیار بنا سکتے ہیں۔

فاسق کی اذان

سوال:

ہماری ایک چھوٹی سی مسجد ہے جس میں کوئی مؤذن نہیں ہے۔ بعض اوقات امام کو دیر ہو جاتی ہے، کیا اس صورت میں داڑھی منڈا ہوا شخص اذان و اقامت کہہ سکتا ہے؟ ﴿عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی﴾

جواب:

شرعاً داڑھی منڈا فاسق معلن ہے، اور فاسق معلن کو مؤذن مقرر نہیں کرنا چاہئے، لیکن جیسا کہ سوال سے ظاہر ہے کہ یہ عام معمول کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ شاذ و نادر ہی ایسی صورت پیش آ جاتی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”اور فاسق کا اذان دینا مکروہ ہے لیکن اگر دے دی گئی تو اعادہ نہیں کیا جائے گا، ذخیرہ میں یہ مسئلہ اسی طرح بیان کیا گیا ہے۔“ ﴿ج ۱، ص ۵۴، مطبع رشیدیہ کوئٹہ﴾

علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ”توفیق“ سے مجھ پر جو بات آشکار ہوئی، وہ یہ ہے کہ شریعت میں اذان کا مقصود اصلی یہ بتانا ہے کہ نماز کا وقت داخل ہو چکا ہے، پھر یہ ہر علاقے میں اسلام کا شعار بن گیا تو اس اعتبار سے کہ دخولِ وقت نماز کی بابت اور اس ضمن میں مؤذن کے قول کے معتبر ہونے کے لئے چند شرائط ہیں، یعنی مسلمان، عاقل و بالغ اور عالم ہونا۔ اور اس سے پہلے ”معین الاحکام“ کے حوالے سے ہم بتا چکے ہیں کہ جب مؤذن مسلمان، مرد، عاقل و بالغ اور اوقات نماز کا جاننے والا ہو تو اس کے اعلانِ دخولِ وقت نماز کیلئے اتنا ہی (یعنی اذان) کافی ہے اور اس کے قول پر اعتبار کیا جائے۔ آگے چل کر علامہ شامی، مجنون، ناقص العقل، نشے میں مدہوش، وغیرہ افراد کی اذان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس سے مقصد اذان تو حاصل ہو جائے گا لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ ان سب کی اذان کا اعادہ مستحب ہے۔ پھر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ بظاہر اس کا

مفہوم یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی اذان کا اعادہ اس صورت میں مستحب ہے جبکہ اذان کے لئے باقاعدہ شرعی شرائط کا حامل مؤذن مقرر ہو، لیکن اگر ایسے لوگوں کی ایک جماعت موجود ہو جو اوقات نماز کے جاننے والے ہوں اور ان کے ہوتے ہوئے کوئی فاسق یا کم عقل بچہ اذان دے تو ایسی اذان نہ تو مکروہ ہے اور نہ ہی اس کا اعادہ کیا جائے گا کیونکہ اذان کا مقصد حاصل ہو چکا۔“

﴿فتاویٰ شامی: ج ۲، ص ۵۸-۵۷، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت﴾

امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ نے فتاویٰ شامی کے حوالہ سے فاسق کی اذان کے اعادہ کو مستحب قرار دیا ہے۔“

﴿فتاویٰ رضویہ ج ۲، ص ۳۸۸، مطبوعہ مکتبہ رضویہ، آرام باغ، کراچی﴾

قضاء نمازوں کے ہوتے ہوئے صلوٰۃ التسبیح پڑھنا

سوال:

زید فرض نمازوں کے ساتھ قضاء نمازیں ادا کر رہا ہے تو کیا زید مہینے میں ایک بار صلوٰۃ التسبیح پڑھ سکتا ہے؟

﴿عرفان اللہ قادری۔ جامع مسجد فہد گارڈن، کراچی﴾

جواب:

صلوٰۃ التسبیح بڑی فضیلت والی نماز ہے، لہذا مہینے میں ایک بار تو کیا اگر کوئی مرد صالح اسے روز ایک بار پڑھے تو نہایت سعادت، اجر و ثواب اور خیر و برکت کی بات ہے۔ لیکن سوال میں آپ نے قضاء نماز کے ساتھ تقابل کر کے اسے پڑھنے کا مسئلہ دریافت فرمایا ہے جس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے پاس اتنا ہی وقت ہے کہ وقتی فرض نماز کو پڑھنے کے بعد یا تو اپنے ذمے واجب الادا قضاء نمازیں پڑھ لے یا صلوٰۃ التسبیح پڑھے، تو ایسی صورت میں نوافل پر قضاء نماز کو ترجیح دینی چاہئے۔ چند ہفتے قبل ہم اسی کالم میں امام احمد رضا قادری علیہ الرحمہ کے حوالے سے حضرت علی کا یہ قول نقل کر چکے ہیں جس کے ذمہ فرائض کی قضاء باقی ہو، اس کے سنت اور نوافل مقبول نہیں ہیں۔ اور سر پر قضاء نمازوں کا بوجھ لدا ہو اور کوئی شخص ان سے عہدہ برا ہونے کے بجائے نوافل پڑھتا رہے تو یہ ایسا ہی ہے کہ کوئی شخص بارِ قرض تلے دبا ہو اور قرض ادا کرنے کے بجائے خیرات بانٹتا پھرے۔

”بکثرت قضا نمازیں باقی ہوں تو ان کی ادائیگی کے لئے سنن مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں“

اس مسئلے پر ایک فتویٰ اور اس کا جواب

سوال:

عرض یہ ہے کہ آپ کی تفہیم المسائل جلد اول کے صفحہ نمبر ۱۱ پر ایک سائل نے آپ سے سوال کیا کہ کیا قضا نمازیں ادا کرنے کے لئے سنت مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: چھوڑ سکتے ہیں، میں نے بھی ایسا کرنا شروع کر دیا، مگر ایک صاحب نے کہا ایسا کرنا غلط ہے، پھر میں نے ایک دارالافتاء سے فتویٰ لیا؟ جو آپ کو ارسال کر رہا ہوں، برائے مہربانی تفصیلی جواب عنایت فرمائیں۔

﴿عرفان اللہ قادری، کراچی﴾

جواب:

پہلے وہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے، جو عرفان اللہ قادری صاحب نے، ”دارالافتاء اہل سنت“ سے حاصل کر کے ہمیں ارسال فرمایا ہے، وہ درج ذیل ہے:

صورتِ مستفسرہ میں زید اپنی قضا نمازوں کی ادائیگی کے لئے سنت مؤکدہ نہیں چھوڑ سکتا کہ سنت مؤکدہ کا ترک اساعت اور نادراً ترک پر عتاب اور ترک کی عادت پر استحقاق عذاب ہے، خاتم المحققین علامہ ابن عابدین شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَالسُّنَنُ نَوْعَانِ، سُنَّةُ الْهُدَى وَتَرْكُهَا يُوجِبُ إِسَاءَةً وَكَرَاهِيَةً۔

﴿رد المحتار ج ۱ ص ۲۱۸، دارالکتب العلمیہ﴾

”اور سنت کی دو قسمیں ہیں، ایک ”سنت الہدیٰ“ اور ان کا چھوڑنا گناہ اور کراہیت کا سبب بنتا ہے۔“

علامہ علاؤ الدین حصکفی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

وَحُكْمُهَا مَا يُؤْجِرُ عَلَى فِعْلٍ وَيُلَاحِظُ عَلَى تَرْكِهِ۔ ﴿الرد المحتار معہ شامی ج ۱ ص ۲۰۰، دارالکتب العلمیہ﴾

”اور ان کا حکم یہ ہے کہ کرنے پر ثواب ملے گا اور چھوڑنے پر ملامت کیا جائے گا،

اس کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمہ تلویح کے حوالے سے فرماتے ہیں:

تَرْكُ السُّنَّةِ الْمُؤَكَّدَةِ قَرِيبٌ مِّنَ الْحَرَامِ يَسْتَحِقُّ حِرْمَانَ الشَّفَاعَةِ لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ: ”مَنْ تَرَكَ سُنَّتِي لَمْ تَنْلُ شَفَاعَتِي وَفِي التَّحْرِيرِ: اَنَّ تَارِكَهَا يَسْتَوْجِبُ التَّضَلُّيلَ وَاللُّؤْمَ، وَالْمُرَادُ اَلتَّرُكُ بِلا عُذْرٍ عَلَى سَبِيلِ الْاِصْرَارِ كَمَا فِي ”شَرْحِ

التَّحْرِيرِ“ لِابْنِ امِيرٍ حَاجَّ - ﴿رد المحتار ج ۱ ص ۲۲۰، دارالکتب العلمیہ﴾

”سنت مؤکدہ کا چھوڑنا حرام کے قریب ہے اور ایسا شخص شفاعت سے محروم ہونے کا مستحق ہے۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: ”جس نے میری سنت کو چھوڑا، وہ میری شفاعت کو نہیں پائے گا“ اور ”تحریر“ میں ہے کہ تارکِ سنت گمراہ قرار دیئے جانے اور ملامت کا سزاوار ہے، مراد یہ ہے کہ جو سنت کو کسی عذر کے بغیر چھوڑے اور اس ترک پر اصرار کرے، جیسا کہ ابن امیر حاج کی ”شرح التحریر“ میں ہے۔“

یہی علامہ شامی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

قَوْلُهُ (وَسَنَّ مُؤَكَّدًا) اَيُ اسْتِنَانًا مُؤَكَّدًا بِمَعْنَى اَنَّهُ طَلَبَ طَلْبًا مُؤَكَّدًا زِيَادَةً عَلَى بَقِيَّةِ النَّوَافِلِ وَلِهَذَا كَانَتْ السُّنَّةُ مُؤَكَّدَةً قَرِيبَةً مِنَ الْوَاجِبِ فِي لُحُوقِ الْإِثْمِ كَمَا فِي الْبَحْرِ۔

”ان (علامہ حنفی) کا قول (اور سنت قرار دیا گیا ہے تاکید کے ساتھ) یعنی اس کا سنت ہونا تاکید ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ باقی نوافل کے مقابلے میں (شارع نے) زیادہ تاکید کے ساتھ اس کے کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ لہذا سنت مؤکدہ (بصورتِ ترک) گناہ کو لاحق ہونے میں واجب کے قریب ہے، جیسے کہ تحریر میں ہے۔“

مذکورہ بالا عبارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ سنت مؤکدہ کی بہت تاکید آئی ہے، جو بلا عذر ایک بار بھی ترک کرے تو مستحقِ ملامت ہے، اور ترک کی عادت کرے تو فاسق مردود الشہادۃ، مستحقِ نار ہے، اور بعض ائمہ نے فرمایا کہ وہ گمراہ ٹھہرایا جائے گا اور گناہ گار ہے، اگرچہ اس کا گناہ واجب کے ترک سے کم ہے۔ تلوتح میں ہے کہ اس کا ترک قریب حرام کے ہے۔ اس کا تارک اس بات کا مستحق ہے کہ معاذ اللہ شفاعت سے محروم ہو جائے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جو میری سنت کو ترک کرے گا اسے میری شفاعت نہ ملے گی، سنت مؤکدہ کو سنن الہدیٰ بھی کہتے ہیں۔ صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: قضاء نوافل سے اہم ہیں، یعنی جس وقت نفل پڑھتا، انہیں چھوڑ کر ان کے بدلے قضائیں پڑھے کہ بری الذمہ ہو جائے، البتہ تراویح اور بارہ رکعتیں سنت مؤکدہ نہ چھوڑے۔“

﴿بہار شریعت ص ۴۷ حصہ چہارم مکتبہ رضویہ﴾

کتبہ مفتی محمد فاروق العطاری المدنی

تصدیق و تصویب مفتی محمد ابوبکر صدیق العطاری،

دارالافتاء اہلسنت، جامع مسجد کنز الایمان

مورخہ: ۱۷/ ستمبر ۲۰۰۱ء

ہمارا جواب ایک خاص سیاق و سباق (Context) میں تھا کہ ایک خاتون کے ذمے چالیس سال کی قضاء نمازیں ہیں اور وہ خاتون وقتی فرض بھی بہ مشکل ادا کر پاتی ہیں، ہم نے ان کے تفصیلی سوال کو اختصار کے ساتھ لکھا تھا، اب سوال یہ درپیش تھا کہ وقتی فرض نماز کے علاوہ ان میں جتنی استطاعت ہے، اس میں اگر سنت مؤکدہ پڑھتی ہیں تو ماضی کی قضاء نمازیں رہ جاتی ہیں، اور اگر اس وقت میں ماضی کی قضاء نمازیں پڑھتی ہیں تو وقتی نماز کی ”سنن مؤکدہ“ رہ جاتی ہیں تو ایسی صورت میں وہ کیا کرے؟ قضاء نماز پڑھنے کو ترجیح دے یا وقتی ”سنن مؤکدہ“ کو؟ تو ہم نے لکھا تھا کہ ماضی کی قضاء نمازوں کو ترجیح دے۔ اس سے العیاذ باللہ! سنتوں کا استخفاف یا ان کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر کسی نے ہماری تحریر سے یہ تاثر لیا ہے تو ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بارگاہ میں عفو و مغفرت کے طلب گار ہیں کہ ہم اپنا پورا مفہوم اپنے قارئین تک نہ پہنچا سکے۔ ”سنن مؤکدہ“ کے فقہی احکام وہی ہیں جو مذکورہ بالا فتوے میں بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں ”سنت مؤکدہ“ کے ترک کو ”تصلیل اور ملامت“ کا موجب قرار دیا گیا ہے وہ بلا عذر اور اصرار پر محمول ہے، علامہ شامی نے ابن الامیر حاج کی ”شرح التخریر“ کے حوالے سے یہی بات لکھی جس کا مذکورہ بالا فتویٰ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ فقہ میں ایک اصول ”الاهم فالاهم“ ہے، یعنی بعض اوقات ایک چیز اہم ہوتی ہے، لیکن جب اس کا اہم ترین چیز سے تعارض ہو جائے تو اہم ترین کے مقابلے میں اہم کو چھوڑ دیتے ہیں۔

چنانچہ علامہ علاء الدین حصکفی لکھتے ہیں:

وَلَا يَجُوزُ تَرْكُهَا لِعَالِمٍ صَارَ مَرْجِعًا فِي الْفُتَاوَى (بِخِلَافِ بَاقِي السُّنَنِ) فَلَهُ تَرْكُهَا لِحَاجَةِ النَّاسِ إِلَى فُتُوَاهُ۔

”اور فجر کی سنتوں کا ایسے عالم کے لئے بھی چھوڑنا جائز نہیں ہے جس سے عامۃ المسلمین فتویٰ کے لئے رجوع کرتے ہوں، جبکہ ایسا ”مرجع فی الفتاویٰ“ باقی سنن مؤکدہ کو چھوڑ سکتا ہے، کیونکہ لوگوں کو اس سے فتویٰ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

اس کے تحت علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(فَلَهُ تَرْكُهَا الْخ) الظَّاهِرُ أَنَّ مَعْنَاهُ أَنَّهُ يُتْرَكُهَا وَقَدْ اِسْتَعَالَ بِالْاِفْتَاءِ لِاجْلِ حَاجَةِ النَّاسِ الْمُجْتَمِعِينَ عَلَيْهِ وَيُنْبَغِي أَنْ يُصَلِّيَهَا إِذَا فَرَغَ فِي الْوَقْتِ وَظَاهِرُ التَّفْرِقَةِ بَيْنَ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَغَيْرِهَا أَنَّهُ لَيْسَ لَهُ تَرْكُ الصَّلَاةِ الْجَمَاعَةِ لِأَنَّهَا مِنَ الشَّعَائِرِ فَهِيَ أَكْثَرُ مِنْ سُنَّةِ الْفَجْرِ وَلِذَا يُتْرَكُهَا لَوْ خَافَ فُتُوتَ الْجَمَاعَةِ، وَأَفَادَ أَنَّهُ يُنْبَغِي أَنْ يَكُونَ الْقَاضِي وَطَالِبُ الْعِلْمِ كَذَلِكَ لَا سِيَّمَا الْمُدَرِّسُ، أَقُولُ: فِي الْمُدَرِّسِ نَظَرٌ بِخِلَافِ الطَّالِبِ إِذَا خَافَ فُتُوتَ الدَّرْسِ أَوْ بَعْضَهُ تَأْمَلْ۔

”(اس کے لئے سنن مؤکدہ کا چھوڑنا جائز ہے) اس کا ظاہر معنی یہ ہے کہ جب فتویٰ دینے میں مشغول ہو تو سنت مؤکدہ کو چھوڑ دے، کیونکہ جو لوگ فتویٰ لینے کے لئے جمع ہیں، ان کی ضرورت ہے، ہاں جب فتویٰ دینے سے فارغ ہو جائے اور نماز کا وقت ہے تو سنتیں پڑھ لے، سنت فجر اور باقی سنن مؤکدہ میں اس فرق سے عیاں ہے کہ اسکی خاطر جماعت نماز کو نہیں چھوڑیں گے، کیونکہ جماعت

کے ساتھ نماز پڑھنا، شعائر اسلام میں سے ہے اور اس کی تاکید سنت فجر سے بھی زیادہ ہے۔ لہذا اگر جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو سنت فجر کو چھوڑ دے، طبیبی نے اس کا یہ فائدہ بھی بتایا ہے کہ قاضی (اگر قضاء میں مشغول ہے) اور طالب علم (اگر استاذ سے سبق پڑھنے میں مشغول ہے) اور اسی طرح مدرس بھی سنن مؤکدہ کو چھوڑ سکتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مدرس کے لئے ترک سنت کی رخصت محل نظر ہے، بخلاف طالب علم کے کہ جب اس کا کل یا بعض سبق فوت ہونے کا اندیشہ ہو (تو اس کی رخصت قابل فہم ہے) اس بار کی پر غور کریں (یعنی طالب علم کے لئے تو مجبوری ہے، استاذ کے لئے مجبوری نہیں ہے)۔“

﴿رد المحتار علی الدر المختار ج ۲ ص ۳۹۵، دار احیاء التراث العربی بیروت﴾

علامہ حصکفی اور علامہ شامی کی ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مفتی کے لئے فتویٰ دینا فرض کفایہ ہے۔ لہذا وہ سنت فجر کے سوا باقی ”سنن مؤکدہ“ چھوڑ سکتا ہے، جبکہ وہ عامۃ المسلمین کے لئے مرجع فتاویٰ ہے اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہے۔ البتہ فتوے کے بعد وقت ملے تو پڑھ لے۔ اسی طرح سنت فجر بھی، جن کی تاکید باقی ”سنن مؤکدہ“ سے زیادہ ہے، اگر جماعت فجر کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو چھوڑ دے، کیونکہ جماعت شعائر دین میں سے ہے اور سنت فجر سے اس کی تاکید زیادہ ہے۔ ”تخصّص فی الدین“ اور ”تفقہ فی الدین“ بھی چونکہ فرض کفایہ ہے اس لئے اگر طالب علم کے سبق اور سنت مؤکدہ میں تعارض ہو جائے تو وہ سنتیں چھوڑ سکتا ہے۔ اور قضاء نماز تو فرض عین ہے، اور اس کی تاکید جماعت اور سنت فجر سے زیادہ ہے، تو بصورت تعارض اسے ترجیح دی جائے گی۔ عام حالات میں تو سنتیں چھوڑنے کا وہی حکم ہے جو مذکورہ بالا فتویٰ میں بتایا گیا ہے، البتہ ”مردود الشہادۃ“ ہونے کا جو مفتی صاحب نے ذکر فرمایا ہے، اس کا ہمیں علم نہیں ہے کیونکہ قرآن نے صرف ”محدود فی القذف“ کو مردود الشہادۃ قرار دیا ہے۔

یہ امر بھی واضح ہو کہ سنن اپنی اصل کے اعتبار سے، خواہ مؤکدہ ہوں یا غیر مؤکدہ، نقلی عبادت ہیں۔ البتہ اہمیت اور حکم شرعی کے اعتبار سے نفل محض، سنت غیر مؤکدہ اور سنت مؤکدہ میں فرق ہے، تعارض کے وقت تدریج کا اعتبار ہوتا ہے۔

امام احمد رضا قادری لکھتے ہیں:

”شیطان کا بڑا دھوکا ہے کہ آدمی کو نیکی کے پردے میں ہلاک کرتا ہے، نادان سمجھتا ہی نہیں، نیک کام کر رہا ہوں، اور نہ جانا کہ نفل بے فرض نرے دھوکے کی ٹٹی ہے، اس کے قبول کی امید تو مفقود اور اس کے ترک کا عذاب گردن پر موجود۔ اے عزیز! فرض خاص سلطانی قرض ہے اور نفل گویا تحفہ و نذرانہ۔ قرض نہ دیجئے اور بالائی بیکار تحفے بھیجئے وہ قابل قبول ہوں گے خصوصاً اس شہنشاہ غنی کی بارگاہ میں جو تمام جہان و جہانیاں سے بے نیاز ہے۔“

﴿فتاویٰ رضویہ ج ۱۰ ص ۱۷۸، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور﴾

اور آگے چل کر حدیث کا حوالہ دیتے ہیں:

لما حضر ابابكر الموت دعا عمر فقال اتق الله يا عمر واعلم ان له عملا بالنهار لا يقبله بالليل وعملا بالليل لا يقبله بالنهار واعلم انه لا يقبل نافلة حتى تؤدى الفريضة الحديث۔ ﴿حلیۃ الاولیاء ج ۱ ص ۳۶، دارالکتاب

العربی بیروت، الجامع الکبیر ج ۱۳ ص ۵۳، مسند ابوبکر صدیق رقم الحدیث: ۱۸۹﴾

”جب خلیفہ رسول اللہ ﷺ سیدنا صدیق اکبر ﷺ کی نزع کا وقت ہوا امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا: اے عمر! اللہ سے ڈرنا اور جان لو کہ اللہ کے کچھ کام دن میں ہیں کہ انہیں رات میں کرو تو قبول نہ فرمائے گا اور کچھ کام رات میں کہ انہیں دن میں کرو تو مقبول نہ ہوں گے، اور خبردار رہو کہ کوئی نفل قبول نہیں ہوتا جب تک فرض ادا نہ کر لیا جائے، الحدیث۔“

امام احمد رضا قادری مزید لکھتے ہیں:

”حضور پر نور سیدنا غوث اعظم مولائے اکرم حضرت شیخ محی الدین ابو محمد عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے اپنی کتاب مستطاب فتوح الغیب شریف میں کیا کیا جگر شکاف مثالیں ایسے شخص کے لئے ارشاد فرمائی ہیں جو فرض چھوڑ کر نفل بجالائے، فرماتے ہیں: اس کی کہاوت ایسی ہے جیسے کسی شخص کو بادشاہ اپنی خدمت کے لئے بلائے، یہ وہاں تو حاضر نہ ہوا اور اس کے غلام کی خدمت گاری میں موجود ہے۔ پھر حضرت امیر المومنین مولیٰ المسلمین سیدنا مولیٰ علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے اس کی مثال نقل فرمائی کہ جناب ارشاد فرماتے ہیں: ایسے شخص کا حال اس عورت کی طرح ہے جسے حمل رہا جب بچہ ہونے کے دن قریب آئے اسقاط ہو گیا اب وہ نہ حاملہ ہے نہ بچہ والی۔ یعنی جب پورے دنوں پر آ کر اسقاط ہو تو محنت تو پوری اٹھائی اور نتیجہ خاک نہیں کہ اگر بچہ ہوتا تو ثمرہ موجود تھا، حمل باقی رہتا تو آگے امید لگی تھی اب نہ حمل نہ بچہ نہ امید نہ ثمرہ اور تکلیف وہی جھیلی جو بچہ والی کو ہوتی۔ ایسے ہی اس نفل خیرات دینے والے کے پاس سے روپیہ تو اٹھا مگر جبکہ فرض چھوڑا یہ نفل بھی قبول نہ ہوا تو خرچ کا خرچ ہوا اور حاصل کچھ نہیں۔ اسی کتاب مبارک میں حضور مولیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ:

﴿فَإِنْ اشْتَغَلَ بِالسُّنَنِ وَالنَّوَافِلِ قَبْلَ الْفَرَائِضِ لَمْ يُقْبَلْ مِنْهُ وَأُهِنَ۔﴾ ﴿فتوح الغیب مع الشرح ص ۲۷۳﴾

”اگر فرض چھوڑ کر سنت و نفل میں مشغول ہو گا یہ قبول نہ ہوں گے اور خوار کیا جائے گا۔

یوں ہی شیخ محقق مولانا عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ نے اس کی شرح میں فرمایا کہ:

ترك آنچه لازم و ضروری ست و اهتمام بآنچه نه ضروری است از فائده عقل و خرد دور است چه دفع ضرر

اہم ست بر عاقل از جلب نفع بلکہ بحقیقت نفع دریں صورت منتفی است۔

”لازم اور ضروری چیز کا ترک اور جو ضروری نہیں اس کا اہتمام، عقل و خرد میں فائدہ سے دور ہے کیونکہ عاقل کے ہاں حصول نفع

سے دفع ضرر اہم ہے بلکہ اس صورت میں نفع منافی ہے۔“ ﴿فتوح الغیب مع شرح عبدالحق الدہلوی ص ۲۷۳﴾

حضرت شیخ اشيوخ امام شہاب المملۃ والدین سہروردی قدس سرہ العزیز عوارف شریف کے باب الثامن والثلاثين میں حضرت خواص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل فرماتے ہیں:

بَلَّغْنَا أَنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ نَافِلَةً حَتَّى يُؤَدَّى فَرِيضَةٌ يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى مَثَلُكُمْ كَمَثَلِ الْعَبْدِ السُّوءِ بَدَأَ بِالْهَدِيَةِ قَبْلَ قَضَاءِ

الدَّيْنِ - ﴿عوارف المعارف ملحق باحياء العلوم باب ۳۸ ص ۱۶۸، مكتبه و مطبع المشهد الحسيني قاهره﴾

”ہمیں خبر پہنچی کہ اللہ عز وجل کوئی نفل قبول نہیں فرماتا یہاں تک کہ فرض ادا کیا جائے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے فرماتا ہے کہ ہاوت تمہاری بد بندہ کی مانند ہے جو فرض ادا کرنے سے پہلے تحفہ پیش کرے۔

خود حدیث میں ہے: حضور پر نور سید عالم ﷺ فرماتے ہیں:

اربع فرضهن الله في الاسلام فمن جاء بثلاث لم يغنين عنه شيئاً حتى ياتي بهن جميعاً الصلوة والزكاة وصيام

رمضان وحج البيت - رواه الامام احمد في مسنده بسند حسن عن عمارة بن حزم رضي الله تعالى عنه -

﴿مسند احمد بن حنبل ج ۴ ص ۲۰۱، دار الفكر بيروت، كنز العمال ج ۱ ص ۳۰ مؤسسته الرساله بيروت﴾

چار چیزیں اللہ تعالیٰ نے اسلام میں فرض کی ہیں جو ان میں سے تین ادا کرے وہ اسے کچھ کام نہ دیں جب تک پوری چاروں نہ بجالائے نماز، زکوٰۃ، روزہ رمضان، حج کعبہ، (اسے امام احمد نے اپنی مسند میں سند حسن کے ساتھ حضرت عمارہ بن حزم رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔

سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

امرنا باقام الصلوة وابتاء الزكاة ومن لم يترك فلا صلوة له - ﴿رواه الطبراني في الكبير بسند صحيح﴾

”ہمیں حکم دیا گیا کہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز قبول نہیں۔ اسے طبرانی نے المعجم الکبیر میں صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ ﴿مجمع الزوائد ج ۳ ص ۶۲، دار الفكر بيروت﴾

سبحان اللہ! جب زکوٰۃ نہ دینے والے کی نماز، روزہ، حج تک مقبول نہیں تو اس نفل خیرات نام کی کائنات سے کیا امید ہے بلکہ انہی سے اصہبانی کی روایت میں آیا کہ فرماتے ہیں:

من اقام الصلوة ولم يؤت الزكاة فليس بمسلم ينفعه -

﴿فتاویٰ رضویہ، ج ۱۰ ص ۱۸۱-۱۷۹ مطبوعه رضافاؤنڈیشن﴾

”جو نماز ادا کرے اور زکوٰۃ نہ دے وہ مسلمان نہیں کہ اسے اس کا عمل کام آئے۔“

فرض کی قضاء بھی فرض ہے اور امام احمد رضا قادری کے بقول جو فرض چھوڑ کر سنت اور نفل میں مشغول ہوگا، یہ قبول نہ ہوں گے اور

ایسا شخص جو فرائض کو ترک کر کے سنت و نفل میں مشغول ہوگا، وہ رسوا ہوگا۔ اسلام کی تعلیمات اور فکر اعلیٰ حضرت سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے کہ اہل سنت بعض مخصوص راتوں اور مخصوص مواقع پر ساری ساری رات عبادت و قیام اور نعت و درود و سلام میں گزار دیتے ہیں، لیکن اپنی روزمرہ زندگی میں فرائض کو وہ اہمیت نہیں دیتے جو ان کا حق ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال کی نمازوں کا بار قضاء ان کے سر پر رہتا ہے اور لمحہ موت کب مقدر ہے، کوئی ایک پل کی گارنٹی نہیں دے سکتا، میں نے مسئلہ ایسے لوگوں پر فرض کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے لکھا تھا اور میری ناقص فہم کے مطابق اعلیٰ حضرت کی فکر بھی یہی ہے۔ باقی صورت مسئلہ کے برعکس کہ کبھی کبھار کسی کی نماز رہ جائے، جبکہ وہ عادتاً نمازی ہو تو ایسی اشخاص کے لئے فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

﴿عالمگیری ج ۱ ص ۱۲۵﴾

”سنن مؤکدہ کے علاوہ دیگر نوافل پڑھنے سے قضاء نمازوں کی ادائیگی میں مشغول ہونا اولیٰ اور اہم ہے۔“

نماز کے لئے کپڑے اڑسنے، موڑنے اور سمیٹنے اور آستینیں چڑھا کر نماز پڑھنے کے مسائل

سوال:

بعض لوگ نماز پڑھنے کے لئے جب کھڑے ہوتے ہیں تو شلوار اور پاجامے کو نیفے سے اڑس لیتے ہیں، بعض لوگ پینٹ کے پانچے کو تھیں بنا کر موڑتے ہیں، بعض لوگ رکوع و سجود میں جاتے وقت کپڑوں کو سمیٹ لیتے ہیں، بعض کی آستینیں چڑھی ہوتی ہیں اور اسی حالت میں نماز پڑھتے ہیں اور بعض لوگ بشرٹ پہن کر نماز پڑھتے ہیں، جن کی آستینیں ہاف کٹ ہوتی ہیں، کہنیوں تک یا کہنیوں سے اوپر تک، ان سب کا کیا حکم ہے۔ ﴿مولانا سید نذیر احمد شاہ، خطیب جامع مسجد اسکاؤٹ کالونی﴾

جواب:

حدیث پاک میں ہے: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو سات (اعضاء) پر سجدہ کا حکم دیا گیا ہے اور بال سنوارنے اور کپڑوں کو موڑنے سے منع کیا گیا۔ ﴿صحیح مسلم، رقم الحدیث ۱۰۰۱﴾

اس حدیث میں ”کفّ ثوب“ سے ممانعت کا حکم ہے۔ ہمارے نزدیک کپڑوں کو نیفے کی جانب اڑسنا، پتلون کے پانچے کی تھیں بنا کر نیچے سے موڑنا اور رکوع اور سجود میں جاتے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنا یا اوپر کو کھینچنا سب اس کا مصداق بنتے ہیں، اسی طرح آستینوں کی تھیں بنا کر موڑنا یا جسے عرف عام میں آستین چڑھانا اور عربی میں ”تشمیر“ کہتے ہیں، اس پر بھی ”کفّ ثوب“ کا اطلاق ہوتا ہے اور مذکورہ بالا حدیث مبارک اور دیگر احادیث کی روشنی کی رو سے ممنوع ہے۔

علامہ علاؤ الدین حصکفی لکھتے ہیں: ”اور کپڑے کا سمیٹنا یعنی اوپر اٹھانا مکروہ ہے، خواہ مٹی سے بچنے کے لئے ایسا کرے، جیسے آستین چڑھانا یا دامن کو اوپر اٹھانا اور کپڑے کے ساتھ کھیلنا۔“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

یعنی جس طرح ایک شخص نماز میں داخل ہوتے وقت ہی آستین یا دامن چڑھائے ہوئے تھا، اس سے اس جانب اشارہ ہے کہ کراہت صرف اس صورت کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ نماز کے اندر آستین چڑھائے تو تب مکروہ ہے، جیسا کہ ”شرح المنیہ“ سے بھی یہی مفہوم مستفاد ہوتا ہے۔ لیکن ”القنیہ“ میں کہا ہے کہ: ”اس امر میں اختلاف رائے ہے کہ ایک شخص نے نماز پڑھی اور وہ (نماز میں داخل ہونے سے) پہلے ہی کسی کام کی بناء پر آستین چڑھائے ہوئے تھا یا اس کی ہیئت ہی ایسے ہے۔“ اس کی مثال یوں ہے، جیسے اس نے وضو کے لئے آستین چڑھائی، پھر امام کے ساتھ رکعت پانے کی خاطر عجلت کی اور اسی حالت میں نماز میں داخل ہو گیا، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بھی مکروہ ہے، تو اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اب نماز کے اندر عمل قلیل کے ذریعے آستینیں کھول دے یا اپنی حالت پر چھوڑ دے، میں نے کسی کتاب میں اس کا جواب نہیں پایا، لیکن زیادہ واضح بات پہلے والی بات ہے (یعنی یہ کہ عمل قلیل سے کھول دے)، اس کی دلیل علامہ حصکفی کے اس قول سے ملتی ہے کہ: ”اگر نمازی کی ٹوپی گر جائے تو اٹھا کر سر پر رکھ لینا ہی افضل ہے، غور کیجئے۔“

آگے چل کر علامہ شامی لکھتے ہیں کہ ”خلاصہ“ اور ”منیہ“ میں کراہت کو اس صورت کے ساتھ مقید کیا ہے کہ آستینیں کہنیوں تک چڑھائی ہوئی ہیں، اور اس کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ کہنیوں سے نیچے تک چڑھانا، باعث کراہت نہیں ہے، لیکن ”البحر الرائق“ میں لکھا ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ مطلقاً آستینیں چڑھانا (کہنیوں سے نیچے ہو یا اوپر) کراہت کا سبب ہے کیونکہ ”کفِ ثوب“ تمام صورتوں پر صادق آتا ہے۔ ﴿ردالمحتار ج ۲ ص ۳۵۰، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت﴾

امام احمد رضا قادری سے پوچھا گیا ”آستینیں کہنی تک چڑھی ہوئی نماز پڑھنی مکروہ ہے یا نہیں؟“ جواب دیا: ”ضرور مکروہ اور سخت و شدید مکروہ ہے۔“ (فتاویٰ رضویہ ج ۷ ص ۳۱۱، مطبوعہ رضافاؤنڈیشن لاہور)۔ ”کفِ ثوب“ کو بیشتر فقہاء کرام نے مکروہ تحریمی کہا ہے اور بقول علامہ ابن عابدین شامی جو کراہت کی نفی کرتے ہیں وہ کراہت تحریمی کی نفی کرتے ہیں، کراہت تنزیہی سب کے نزدیک ثابت ہے، (منحۃ الخالق حاشیۃ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۴) اور اس حکم کراہت میں وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو شروع میں ذکر کردی گئی ہیں۔ نماز میں ہیئت لباس کے بارے میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے، ”اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنا لباس (زینت) اختیار کیا کرو۔“

یعنی نماز باوقار لباس پہن کر پڑھنی چاہئے اور اوپر ”کفِ ثوب“ کی جتنی صورتیں بیان کی ہیں، یہ سب وقار کے منافی ہیں، یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ وضع اختیار کر کے کسی باوقار اور ذی وجاہت ہستی کے سامنے نہیں جاتا، چہ جائے کہ ”احکم الحاکمین“ کی بارگاہ میں حاضر ہو۔

اگر کوئی شخص ہاف کٹ آستین والی قمیص پہنے ہوئے ہے، یعنی ایسی قمیص جس کی آستین کی اصل وضع اور ساخت ہاف کٹ ہے، یعنی کہنیوں یا اس سے اوپر ہے، اس کو پہن کر نماز پڑھی جائے تو مکروہ نہیں ہوگی، کیونکہ نماز میں پہنچوں تک آستینوں کا رکھنا ضروری نہیں ہے، عہد رسالت سے لے کر آج تک کے مسلمان احرام باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور احرام میں پوری کلائیاں ڈھکی ہوئی نہیں ہوتیں اور نہ انہیں ڈھکنے کا حکم دیا گیا ہے، نیز نبی ﷺ اور متعدد صحابہ کرام نے ایک کپڑا اپنے جسم پر لپیٹ کر بھی نماز پڑھی ہے اور اس صورت میں پوری کلائیوں کا ڈھکنا متصور ہی نہیں ہے۔

امام کا مسجد میں ہوائی چیل پہن کر پھرنا

سوال:

ہمارے محلے کی مسجد کے امام قاری صاحب گزشتہ ہفتہ سے مسجد میں ہوائی چیل پہن کر آ رہے ہیں۔ ایک دن کسی نمازی نے یہ سوچ کر سوال کر دیا کہ کہیں بھول کر چیل نہ پہن لی ہو، پوچھا ”قاری صاحب! آپ نے بھول کر تو چیل نہیں پہنی؟“ اس پر قاری صاحب نے چار پانچ نمازیوں کی موجودگی میں جواب دیا کہ ”یہ چیل پاک و صاف ہے، میں اسے پہن کر نماز بھی پڑھتا ہوں، بلکہ نماز پڑھا بھی سکتا ہوں۔“ اس جواب پر نمازیوں پر سکتہ طاری ہو گیا، سب نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی، لیکن اب یہ صورتحال فتنہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے، ازراہ کرم اس مسئلے کی شرعی حیثیت بیان کر کے ہمیں مطمئن کریں؟ ﴿آغا عبدالوحید خان، جہانگیر روڈ، کراچی﴾

جواب:

صحیح بخاری میں ایک باب کا عنوان ہے ”باب الصلوٰۃ فی النعال“ اس باب کے تحت امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ اپنی سند کے ساتھ ابو مسلمہ سعید بن زید از دی سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت انس بن مالک سے پوچھا: ”کیا نبی ﷺ جوتا پہن کر نماز پڑھتے تھے؟ انہوں نے کہا: ”جی ہاں۔“ اس حدیث کے تحت علامہ بدرالدین ابو محمد محمود عینی متوفی ۸۵۵ھ نے جوتے پہن کر نماز پڑھنے یا جوتے کے اوپر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے اور ناپاک جوتے کے پاک ہونے کے مسائل اور اس سلسلے میں ائمہ کے اقوال بیان کئے ہیں، بحث کے اختتام پر وہ لکھتے ہیں کہ اس سے ایک مسئلہ یہ واضح ہوتا ہے کہ مسجد میں (پاک) جوتے پہن کر چلنا جائز ہے۔

﴿عمدة القاری شرح صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۲۰-۱۱۹ مطبوعہ بیروت﴾

لیکن چونکہ آج کل مساجد عہد نبوی ﷺ، اور عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح کچی یا ریتیلے فرش کی نہیں ہوتیں، بلکہ بہت صاف و شفاف پختہ فرش کی ہوتی ہیں، دریاں یا قالین بچھے ہوتے ہیں، اس لئے جوتے پہن کر ان پر چلنا پھرنا، خواہ وہ جوتے پاک ہی کیوں نہ ہوں، لوگوں کی نفاست طبع پر گراں گزرتا ہے اور اب جوتے پہن کر مساجد میں جانا یا چلنا پھرنا کہیں بھی معمول نہیں ہے، اس لئے امام

صاحب کو اس سے اجتناب کرنا چاہئے، یہ امر کوئی سنت و مستحب تو ہے نہیں کہ حصولِ ثواب کے لئے اس پر اصرار کیا جائے، زیادہ سے زیادہ یہ سنن زوائد میں سے ہے۔

چنانچہ شیخ نظام الدین متوفی ۱۱۶۱ھ لکھتے ہیں:

”اور جوتے پہن کر مسجد میں داخل ہونا مکروہ ہے۔“ ﴿فتاویٰ عالمگیری ج ۵ ص ۳۳۱، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ﴾
فتاویٰ سراجیہ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح بیان کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے کئی صدیاں قبل بھی امت مسلمہ میں یہ مسئلہ معروف تھا کہ جوتے پہن کر مسجد میں نہیں جانا چاہئے اور شریعت کا مزاج یہ ہے کہ اگر کسی بات سے لوگوں کے فتنہ میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو جواز بلکہ بعض صورتوں میں افضلیت کے باوجود اس کا چھوڑ دینا بہتر ہے۔

حدیث پاک میں ہے:

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے (حطیم کعبہ کی) دیواروں کی بابت پوچھا کہ کیا وہ بیت اللہ کا حصہ ہیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، میں نے عرض کیا تو انہیں بیت اللہ میں داخل کیوں نہیں کیا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم (قریش) کے پاس (تعمیری فنڈ کی) کمی واقع ہو گئی تھی، (حضرت عائشہ فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا اس (بیت اللہ) کا دروازہ بلند کیوں ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تمہاری قوم نے اسے بلند اس لئے رکھا تا کہ (ان کی اجارہ داری رہے اور) وہ جسے چاہیں بیت اللہ میں داخل ہونے دیں، اور اگر تمہاری قوم نئی مسلمان نہ ہوئی ہوتی اور ان میں زمانہ جاہلیت کے اثرات نہ ہوتے اور مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ان کے ذہن اسے قبول نہیں کریں گے تو میں (حطیم کعبہ کی) دیواروں کو (عمارت) بیت اللہ میں شامل کر دیتا اور (بیت اللہ کے) دروازے کو سطح زمین سے ملا دیتا۔ ﴿صحیح بخاری رقم الحدیث: ۱۴۸۹، کتاب الحج﴾

امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول روایت کیا ہے: ”لوگوں سے ان کے عرف کے مطابق بات کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ (تمہاری بے تدبیری سے) اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے۔“

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ۔ ﴿النحل: ۱۲۵﴾

” (لوگوں کو) اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلائیے اور ان سے بحث بھی کرنی ہو تو احسن طریقے

سے کیجئے۔“

کسی امام یا مبلغ دین کا کسی مسئلے کو جواز بنا کر مسلمانوں کی عقیدت کو مجروح کرنا حکمتِ دعوت و ارشاد کے منافی ہے اور اپنے علمی زعم

وافتحار میں مبتلا ہونے کی دلیل ہے۔ کسی مقدس و متبرک مقام کی تعظیم کے لئے جوتے اتارنا قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿طہ: ۱۱، ۱۲﴾ فَلَمَّا أَتَاهَا نُودِيَ يَمُوسَىٰ ۖ إِنِّي أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۖ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ

”جب وہ (موسیٰ) آگ کے پاس آئے تو انہیں ندا کی گئی، اے موسیٰ! بیشک میں تیرا رب ہوں، تو (آپ) اپنے جوتے اتار دیں، یقیناً آپ وادی مقدس طویٰ میں ہیں۔“

اس آیت کے تحت امام ابو عبد اللہ محمد قرطبی اپنی تفسیر ”الجامع لاحکام القرآن“ میں لکھتے ہیں:

”(اس موقع پر) اللہ تعالیٰ سے کلام کے وقت عاجزی اور تواضع کے لئے جوتے اتارنے کا حکم دیا گیا ہے اور سلف صالحین سے لے کر آج تک بیت اللہ کا طواف کرتے وقت تعظیماً جوتے اتار لئے جاتے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ وادی مقدس کی تعظیم کے لئے یہ حکم ہوا، جیسا کہ حرم پاک کی تعظیم کے لئے جوتے پہن کر داخل نہیں ہوتے، اور آگے چل کر امام قرطبی ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ حضرت بشیر بن خصاصیہ جوتے پہن کر قبروں کے درمیان چل رہے تھے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ”جب تم اس جگہ (یعنی قبرستان میں) ہو تو اپنے جوتے اتار لیا کرو۔“ ﴿الجامع لاحکام القرآن ج ۱۱ ص ۱۷۳، مکتبہ الغزالی دمشق﴾

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم وجوباً نہیں فرمایا بلکہ یہ استحباب کے درجے میں ہے، اور جب قبور اور اہل قبور کا اتنا ادب ہے تو مسجد کا ادب تو اس سے زیادہ ہونا چاہئے، کیونکہ حدیث پاک میں آیا ہے ”مسجدیں اللہ کا گھر ہیں (یعنی اس کی عبادت اور رحمت و برکت کے نزول کے مقدس مقامات ہیں)۔“

جمعہ کی سنتیں

سوال:

جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے اور بعد کتنی سنتیں پڑھنی چاہئیں اور ان کی ترتیب کیا ہے؟ ﴿شوکت علی، نیو کراچی﴾

جواب:

جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے چار سنتیں پڑھنی چاہئیں اور نماز جمعہ کے بعد چھ سنتیں، اس طرح کہ پہلے چار سنتیں پڑھ کر سلام پھیر دیں اور پھر دو سنتیں پڑھ کر سلام پھیریں۔

علامہ شمس الدین محمد بن احمد سرحسی المبسوط ج ۱ ص ۵۷ پر رقم طراز ہیں: ”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جمعہ سے پہلے چار رکعت پڑھا کرتے تھے اور جمعہ کے بعد کی سنتوں میں اختلاف ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ چار رکعت پڑھتے تھے۔ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کا اسی پر عمل ہے، کیونکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی

کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے وہ چار رکعت نماز پڑھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد چھ رکعت نماز پڑھتے تھے، پہلے چار رکعت، اس کے بعد دو رکعت، امام ابو یوسف کا اس پر عمل ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پہلے دو اور پھر چار رکعت نماز پڑھتے تھے، بعض علماء نے ظہر کے بعد کی سنتوں پر قیاس کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھے تاکہ ایک فرض کے بعد اس کی مثل نفل پڑھنا لازم نہ آئے۔ مصنف ابن ابی شیبہ ج ۲ ص ۳۲ میں ہے عطا کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جمعہ کے بعد چھ رکعات پڑھتے تھے، پہلے دو رکعت پھر چار رکعت، جامع ترمذی ص ۱۰۱ پر ہے، حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جمعہ کے بعد پہلے دو رکعت پڑھی جائیں پھر چار، فقہاء احناف نے امام ابو یوسف کے قول کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ جمعہ کے بعد پہلے چار رکعت پڑھی جائیں اور پھر دو، علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں فقہاء احناف کے حوالے سے یہی قول نقل کیا ہے، اس مسئلے کی پوری تفصیل شرح صحیح مسلم مصنفہ علامہ سعیدی صاحب کی ج ۲ ص ۴۴۵-۴۴۶ پر موجود ہے۔

مسافر قصر نماز کہاں سے شروع کرے؟

سوال:

ایک شخص دیہات سے پندرہ دن سے کم کے ارادے سے سفر کرتا ہے۔ کیا قصر فوراً شروع ہوگی یا مقررہ فاصلہ طے کرنے کے بعد؟

﴿محمد الیاس، لائڈھی﴾

جواب:

اگر کوئی شخص اپنے شہر، قصبے یا گاؤں سے اتنی مسافت کے سفر پر روانہ ہوتا ہے جو سفر شرعی کہلاتا ہے اور جس سے قصر لازم ہے (یعنی ۹۸.۷ کلومیٹر یا ۶۱ میل ۴۶۰ گز)، تو جب وہ اپنی بستی کی حدود سے نکل کر جائے تو قصر شروع کر دے۔ شہروں اور قصبات کی حدود آج کل کارپوریشن اور میونسپلٹی یعنی بلدیاتی ادارے طے کرتے ہیں اور دیہاتوں کی حدود کو مقامی لوگ خود سمجھتے ہیں۔

قصر واجب ہے؟

سوال:

جب کوئی آدمی جانتا ہو کہ قصر واجب ہے، مگر وہ پوری نماز پڑھے تو وہ کیسا ہے؟ ﴿محمد الیاس، لائڈھی﴾

جواب:

احناف کے نزدیک حالتِ سفر میں قصر واجب ہے، لہذا قصر کو ترک کر کے پوری نماز پڑھنے والا گنہگار ہوگا۔ درمختار میں ہے (یعنی) پوری نماز پڑھنا مسافر کے حق میں رخصت نہیں ہے بلکہ ایسا کرنے والا گنہگار ہے۔

سفر میں سنتِ مؤکدہ پڑھنے کا مسئلہ

سوال:

کیا مسافر سنتِ مؤکدہ پڑھے یا نہ پڑھے، نیز کیا ایسا کوئی عذر شرعی ہے جس سے سنتِ مؤکدہ چھوڑ سکتے ہیں؟

﴿محمد الیاس، لائڈھی﴾

جواب:

اگر مسافر دورانِ سفر اپنی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے تو راستے میں وہ سنتِ مؤکدہ چھوڑ دے، اور اگر وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گیا ہے اور حالتِ قرار و سکون میں ہے تو سنتِ مؤکدہ پڑھ لیا کرے اور پوری پڑھے، مگر فجر کی دو سنتیں ہر حال میں یعنی دورانِ سفر بھی پڑھے، کیونکہ فجر کی تاکید زیادہ آئی ہے، ﴿فتاویٰ شامی طبع جدید ج ۲ ص ۵۳۵﴾

فجر کی قضاءِ ظہر میں پڑھنا

سوال:

کیا نماز فجر کی قضاءِ نماز ظہر کے بعد ایک ساتھ ادا کر سکتے ہیں؟ ﴿محمد شاہد اعجاز۔ ناظم آباد، کراچی﴾

جواب:

جی ہاں۔ بالکل پڑھ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ صاحبِ ترتیب ہیں، شروع سے یا اب بن چکے ہیں، تو پہلے فجر کی قضاء پڑھیں، پھر ظہر کی ادا پڑھیں ”صاحبِ ترتیب“ وہ شخص ہے جس کی کبھی چھ نمازیں مسلسل قضاء نہ ہوئی ہوں۔ اصل اور کامل صاحبِ ترتیب تو وہی کہلائے گا کہ جب سے بالغ ہوا ہے اور اس پر نمازیں فرض ہوئی ہیں اس نے کبھی چھ نمازیں تسلسل کے ساتھ قضاء نہیں کیں لیکن آج کل عملی تنزل کے دور میں فقہاءِ کرام اس کو بھی صاحبِ ترتیب شمار کرتے ہیں جو زندگی کے کسی بھی مرحلے میں کچھلی نمازیں جو اس کے ذمے واجب الاداتھیں، ادا کر کے دوبارہ صاحبِ ترتیب بن گیا ہو اور اب اس پر مداومت و پابندی کر رہا ہو۔

دعا کے وقت ہاتھ کیسے رکھے جائیں

سوال:

بعض لوگ دعا کے وقت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں مکمل ملا کر رکھتے ہیں، بعض ایک دو انگلیوں کی نوک ملا دیتے ہیں، بعض دونوں ہاتھوں کو الگ الگ رکھتے ہیں، صحیح طریقہ کیا ہے، سنت رسول اللہ ﷺ کے مطابق کون سا طریقہ ہے ﴿مولانا علی عمران صدیقی..... اورنگی ٹاؤن﴾

جواب :

اس مسئلے کی وضاحت سے پہلے مندرجہ ذیل احادیث ملاحظہ فرمائیے:

حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ دعاء استسقاء (یعنی نزول بارش کی دعاء) کے سوا کسی اور دعاء میں اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اور دعاء استسقاء میں آپ ہاتھوں کو اتنا بلند فرماتے کہ آپ کی دونوں بغلوں کی سفیدی نظر آتی۔ ﴿صحیح بخاری، ج ۱، ص ۱۴۰﴾

اس حدیث کی شرح میں امام نووی لکھتے ہیں:

اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ دعاء استسقاء کے سوا اور مواقع پر دعاء کے وقت اپنے ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ ”دعاء استسقاء“ کے علاوہ اور بے شمار مواقع پر بھی دونوں ہاتھ اٹھانا ثابت ہے اور میں نے ”شرح المہذب“ میں باب صفۃ الصلوۃ کے آخر میں صحیح بخاری و صحیح مسلم کی تقریباً تیس احادیث کو اس موضوع پر جمع کیا ہے، اور علامہ غلام رسول سعیدی نے اپنی تفسیر ”تبیان القرآن“ (ج ۴، ص ۱۸۳-۱۷۲) میں بیرون نماز ہاتھ اٹھا کر دعاء کرنے کے موضوع پر چالیس احادیث مبارکہ مکمل حوالوں کے ساتھ درج کی ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حدیث کی کیا تاویل کی جائے گی؟ تو اس کی تاویل یہ ہے کہ دیگر مواقع پر آپ دعاء میں ہاتھ اٹھاتے تو تھے لیکن اس حد تک بلند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگے یا اس کی تاویل یہ کی جائے کہ ہو سکتا ہے انہوں نے نہ دیکھا ہو لیکن اور صحابہ کرام نے دیکھا ہو کہ حضور ﷺ نے اکثر اوقات دعاء کے وقت ہاتھ اٹھائے ہیں۔

اور قاعدہ شرعیہ یہ ہے کہ جب کسی مسئلے میں ایک قول اثبات کا ہو اور ایک نفی کا تو اثبات کو ترجیح دی جائے گی اور یہاں تو نفی کا قول کرنے والے ایک ہیں اور اثبات کا قول ایک جماعت کثیر کا ہے۔

﴿صحیح مسلم بشرح الامام ابوزکریا یحییٰ بن شرف النووی الدمشقی المتوفی ۵۶۷ھ، ج ۴، ص ۲۵۲۴ کتاب

صلوۃ الاستسقاء﴾

علامہ شہاب الدین احمد بن علی ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ لکھتے ہیں:

قَالَ النَّوَوِيُّ: قَالَ الْعُلَمَاءُ السُّنَّةُ فِي كُلِّ دُعَاءٍ لِرَفْعِ الْبَلَاءِ أَنْ يَرْفَعَ يَدَيْهِ جَاعِلًا ظُهُورَ كَفِّهِ إِلَى السَّمَاءِ وَإِذَا دَعَا بِسُوءِ شَيْءٍ وَتَحْصِيلُهُ أَنْ يَجْعَلَ كَفِّهِ إِلَى السَّمَاءِ انْتَهَى، وَقَالَ غَيْرُهُ: الْحِكْمَةُ فِي الْإِشَارَةِ لِظُهُورِ الْكَفِّينِ فِي الْإِسْتِسْقَاءِ دُونَ غَيْرِهِ لَلْتَفَاوُلِ بِتَقَلُّبِ الْحَالِ ظَهْرًا لِبَطْنٍ كَمَا قِيلَ فِي تَحْوِيلِ الرَّدَّاءِ أَوْهُوَ إِشَارَةٌ إِلَى صِفَةِ الْمَسْئُولِ وَهُوَ نُزُولُ السَّحَابِ إِلَى الْأَرْضِ۔

”امام نووی نے کہا ہے: علماء کہتے ہیں کہ دعاء میں سنت طریقہ یہ ہے کہ جو دعاء کسی مصیبت کو دور کرنے کے لیے کی جائے اس میں دونوں ہاتھ بلند کیے جائیں اور ہاتھوں کی پشت آسمان کی طرف رکھی جائے، اور جب کسی نیک مقصد کے حصول کی دعاء کی جائے تب بھی ہاتھ اٹھائے جائیں اور ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھا جائے، اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ دعاء استسقاء میں بطور خاص ہاتھوں کی پشت کو آسمان کی طرف کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ہتھیلی کی جگہ پشت کو (اوپر کر کے) تبدیلی حال سے نیک فال لینا ہے جیسا کہ اس موقع پر چادر کو پلٹ کر اوپر کا حصہ نیچے کیا جاتا ہے، یا اس طریقے سے جو چیز مانگی جا رہی ہے اس کی ہیئت کی طرف اشارہ مقصود ہے (یعنی اے اللہ! جس طرح میری ہتھیلیوں کا رخ زمین کی طرف ہے اسی طرح تو اپنی قدرت سے) زمین پر بارش نازل فرما۔“

﴿فتح الباری ج ۳، ص ۲۱۲، مکتبہ دار الفکر، کتاب الاستسقاء﴾

ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعاء میں بالعموم ہاتھوں کو بلند کرنا سنت ہے۔ نماز استسقاء یا دعاء دفع شر میں ہتھیلیوں کی پشت آسمان کی طرف بھی کر سکتے ہیں، حصول خیر و برکت اور دیگر مواقع پر ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف رکھنا چاہئے۔ دعاء استسقاء میں بھی دونوں اعتبارات ہو سکتے ہیں۔ ایک دفع شر کا یعنی قحط اور خشک سالی کا دور ہونا اور ایک حصول منفعت کا یعنی باران رحمت کا نزول اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دعاء دفع شر میں ہتھیلیوں کی پشت کو جو آسمان کی طرف کرتے ہیں، یہ تبدیلی حال کے لیے نیک فال کے طور پر ہے، ہاتھ اتنے زیادہ بلند کرنا کہ بغلیں نظر آئیں، یہ بھی مستحب ہے۔ باقی چونکہ الفاظ حدیث میں ہاتھوں کو ملا کر رکھنے کی کہیں ممانعت وارد نہیں ہوئی اس لیے دعا کے وقت ہاتھوں کو ملا کر (خواہ کسی بھی انداز سے ہوں) بھی رکھ سکتے ہیں لیکن ہاتھوں کو کھلا رکھنا سنت سے زیادہ قریب تر معلوم ہوتا ہے۔

نماز میں کوئی سورت دوبارہ پڑھنا

سوال:

نماز میں کوئی بھی سورت دوبارہ پڑھ لی جائے، یعنی بھول کر تو اس کی تلافی کیسے ہوگی؟ ﴿محمد شاہد اعجاز، کراچی﴾

جواب:

نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔

سوال:

نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد کوئی سورت یاد نہ آ رہی ہو تو کیا نماز توڑ کر دوبارہ پڑھیں؟

جواب:

نماز مکمل کر کے سجدہ سہو کر لیں، نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

مسبق اپنی بقیہ نماز کس طرح ادا کرے؟

سوال:

ایک شخص نے امام کی اقتداء کی اور آخری قعدے میں امام کے ساتھ آ کر شامل ہوا، اب امام کے سلام پھیرنے کے بعد وہ اپنی بقیہ نماز کس طرح پڑھے، الٹی ترتیب سے یا سیدھی ترتیب سے؟ ﴿م-الف-ع، کراچی﴾

جواب:

جس مقتدی کی نماز کی ابتدائی ایک رکعت یا اس سے زائد نماز رہ گئی ہو اور وہ دوران نماز امام کے ساتھ آ کر شامل ہوا، اسے فقہی اصطلاح میں مسبوق کہتے ہیں۔ آپ نے جو صورت سوال میں بیان کی ہے، اس کی رو سے وہ اپنی نماز صحیح ترتیب کے ساتھ ابتدا سے پڑھے گا، یعنی کھڑے ہو کر ثناء پڑھے پھر اعوذ باللہ، پھر بسم اللہ اور پھر حسب ترتیب پہلی دو رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد سورت ملائے گا اور آخری دو رکعت میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا اور اس طرح اپنی نماز مکمل کرے گا۔ اگر چار رکعت والی نماز میں درمیان والے قعدے میں یا تیسری رکعت میں حالت قیام میں یا رکوع میں امام کے ساتھ ملا ہے تو وہ بعد میں اٹھ کر اپنی ابتدائی دو رکعت پڑھے جس میں ثناء (سبحانک اللہم) اور تعوذ و تسمیہ (اعوذ باللہ، بسم اللہ) کے بعد سورہ فاتحہ کے ساتھ سورت بھی ملانی جاتی ہے۔ اگر چوتھی رکعت میں امام کے ساتھ ملا ہے تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد ایک رکعت ثناء، تعوذ، تسمیہ اور فاتحہ مع سورت کے ساتھ پڑھے گا اور اس طرح اس کی اپنی دو رکعت ہو جائیں گی۔ اس کے بعد درمیانی قعدہ کرے گا، پھر اٹھ کر ایک رکعت فاتحہ مع سورت پڑھے گا اور آخری رکعت میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے گا۔ اگر وہ دوسری رکعت میں امام کے ساتھ شامل ہو تو آخر میں اٹھ کر ایک رکعت ثناء، تعوذ، تسمیہ اور فاتحہ مع سورت کے ساتھ پڑھ کر نماز مکمل کر کے سلام پھیر دے گا۔

نوافل تہجد کی جگہ قضاء پڑھنا

سوال:

ایک شخص کے ذمے قضاء نمازیں ہیں، لیکن اب وہ باقاعدہ تہجد گزار بھی ہے، تو اگر وہ نوافل تہجد کی جگہ قضاء نمازیں پڑھتا رہے تو کیا اسے تہجد کا ثواب ملے گا؟
﴿بہار احمد مشتاق۔ دستگیر کالونی، کراچی﴾

جواب:

جب تک کسی کے ذمے قضاء نمازیں رہتی ہوں، اسے نوافل پر فرائض و واجبات کی قضاء کو ترجیح دینی چاہئے، کیونکہ زندگی کی گارنٹی کسی کے پاس نہیں ہے کہ کل آنے والا دن اسے نصیب ہوگا یا نہیں۔ نوافل کا اجر و ثواب اور برکات اپنی جگہ مسلم ہیں، لیکن نوافل نہ پڑھنے پر آخرت میں مسئولیت نہیں ہوگی، جبکہ فرائض و واجبات کی آخرت میں جواب دہی لازمی ہے۔ لہذا تہجد کے نوافل کی جگہ وہ قضاء نمازیں پڑھنی چاہئیں جو کسی کے ذمے باقی ہیں۔ امام احمد رضا خان قادری نے فتاویٰ رضویہ میں متعدد حوالہ جات کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طویل وصیت نقل کی ہے جو انہوں نے عالم نزع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کی، اس طویل وصیت کے آخر میں فرمایا ”جان لو! جب تک فرائض ادا نہ کر دیئے جائیں، نوافل قبول نہیں ہوں گے۔“ اسی طرح انہوں نے فتوح الغیب مؤلفہ شیخ عبدالقادر جیلانی کے حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ”اگر کوئی شخص فرائض کو چھوڑ کر سنت و نفل میں مشغول ہوگا تو یہ (بارگاہِ الہی میں) قبول نہیں ہوں گے اور وہ خوار ہوگا۔“ اسی طرح انہوں نے عوارف المعارف کے حوالے سے شیخ الشیوخ شہاب الدین سہروردی کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ”ہمیں یہ خبر پہنچی ہے کہ جب تک فرائض ادا نہ کئے جائیں، اللہ تعالیٰ نوافل کو بھی قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے فرماتا ہے کہ تمہاری مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو قرض تو ادا نہیں کرتا اور تحفے بانٹتا پھرتا ہے۔“ باقی جو شخص رات کے پچھلے پہر اپنی راحت و نیند کو قربان کر کے اٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہے، خواہ وہ گزشتہ فرائض کی قضاء ہی کیوں نہ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بعید نہیں ہے کہ وہ اسے ”قیام لیل“ اور ”تہجد“ کا ثواب عطا فرمائے لیکن یہ کوئی ضابطہ شرعیہ نہیں ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کی رحمت تو اپنے بندوں پر برسنے کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

وضو اور نماز کے باطل ہونے کا غلط مسئلہ

سوال:

ایک معروف ہفت روزہ جریدہ (اخبار جہاں) کی ۱۶ تا ۲۲ اپریل ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں ”کتاب وسنت کی روشنی میں“ کے عنوان

کے تحت ایک سائل نے پوچھا کہ: وضو میں لوگ جب سر کا مسح کرنے لگتے ہیں تو ہاتھ بھگو کر پہلے اسے چومتے ہیں اور پھر سر کا مسح کرتے ہیں۔ کیا یہ طریقہ صحیح ہے؟ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ اس طرح مسح نہیں ہوتا جو وضو کے فرائض میں سے ہے اور جب ایک فرض چھوٹ گیا تو وضو نہ ہوا اور بغیر وضو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، اس طرح نماز نہیں ہوگی، کیا مفتی صاحب کا یہ جواب درست ہے؟ ﴿مولانا عنایت اللہ۔ آرام باغ، کراچی﴾

جواب:

مفتی صاحب کا یہ جواب درست نہیں ہے۔ اگرچہ ہاتھ ترک کرنے کے بعد سر کا مسح کرنے سے پہلے ہاتھوں کا چومنا ثابت نہیں ہے لیکن اگر کسی نے لاعلمی کی بناء پر ایسا کر لیا تو سر کا مسح شرعاً صحیح ہو جائے گا اور چونکہ کوئی فرض ترک نہیں ہوا اس لئے وضو بھی صحیح ادا ہو گیا اور اس وضو سے نماز بھی صحیح ادا ہو جائے گی۔

سفر کی قضاء حضر میں اور حضر کی قضاء سفر میں

سوال:

دوران سفر نمازیں رہ گئی ہوں اور واپس گھر آ کر ان کی قضاء پڑھنا چاہے تو قصر پڑھے یعنی چار فرض کی جگہ دو یا پوری پڑھے گا؟ ﴿بہار احمد مشتاق، کراچی﴾

جواب:

قضاء میں حالت ادا کا اعتبار نہیں بلکہ حالت قضاء کا اعتبار ہے۔ لہذا سفر کی قضاء گھر پر آ کر پڑھی جائے تو قصر ہی پڑھے گا اور گھر پر اقامت کے دوران قضاء شدہ نمازیں سفر میں پڑھنا چاہے تو ان کی قضاء پوری پڑھے گا۔

کیا توبہ کے بعد بھی قضاے عمری پڑھنا ضروری ہے؟

سوال:

سورہ توبہ آیت: ۱۱ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”اگر یہ لوگ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہو جائیں گے۔“ اگر کاہلی اور سستی کی وجہ سے کسی شخص کی پندرہ بیس سال کی نمازیں قضاء ہو گئی ہوں لیکن اب وہ شخص صدق دل سے توبہ کر کے گزشتہ تیس سال سے باقاعدگی کے ساتھ باجماعت نماز ادا کر رہا ہے، تو کیا صدق دل سے توبہ کے بعد بھی قضاے عمری پڑھنا ضروری ہے؟ ﴿بہار احمد مشتاق۔ گلشن مصطفیٰ۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی﴾

جواب:

یہ آیت یہود، منافقین اور کفارِ مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ اگر وہ صدقِ دل سے کفر و نفاق سے توبہ کر کے مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں اور اسلام پر مکمل طریقے سے کاربند ہیں تو وہ اسلامی برادری کے رکن بن چکے ہیں اور انہیں وہی تحفظات حاصل ہوں گے جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہیں، ان کے تاریک، گمراہ کن اور مسلمانوں سے بغض و عناد پر مبنی ماضی کے پیش نظر ان کے ساتھ نہ کوئی امتیازی سلوک کیا جائے گا اور نہ ہی انتقامی کارروائی کی جائے گی کیونکہ ”اسلام ماضی کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔“ چنانچہ اگلی آیت میں فرمایا ”اور اگر یہ لوگ اپنے عہد کے بعد اپنی قسمیں توڑ دیں اور تمہارے دین میں طعنہ زنی کریں تو کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو، بلاشبہ ان کی قسموں کو کوئی اعتبار نہیں، تاکہ وہ کفر سے باز آجائیں۔“ اس کے برعکس مسلمان جب ماضی کے گناہوں سے صدقِ دل سے توبہ کرے گا تو توبہ کی صحت کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شریعت نے جن گناہوں کی تلافی کی جو صورتیں مقرر کر رکھی ہیں، ان پر بھی عمل کرے۔ مثلاً قسم کھا کر توڑ دی ہے تو اس کا کفارہ ادا کرے، کسی کا حق غصب کیا ہے تو اسے واپس کرے، زکوٰۃ ادا نہیں کی تو ماضی کی تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے اور جو نمازیں قضاء ہو چکی ہیں تو ان کی قضاء پڑھے اور اپنی تقصیر قضاء پر اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگے۔

صلوة التسبیح باجماعت پڑھنا

سوال:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ صلوٰۃ التسبیح باجماعت کے لئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اشتہار شائع کرنا از روئے شرع درست ہے یا نہیں؟ دلائل کی روشنی میں مسئلہ ہذا کی وضاحت فرما کر ممنون فرمائیں۔

﴿الطاف حسین۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی﴾

جواب:

صورتِ مسئلہ میں صلوٰۃ التسبیح باجماعت کے لئے باقاعدہ اعلان کرنا اور اشتہارات شائع کرنا ”تداعی“ ہے، اور نوافل باجماعت بالتداعی اگر دائماً یعنی ہمیشہ ہو تو فقہاء نے اسے مکروہ لکھا ہے اور اگر دائماً نہ ہو بلکہ سال میں ایک یا دو مرتبہ ہوں تو یہ بہت سے علماء متقدمین سے ثابت ہے جن میں حضرت لقمان بن عامر، خالد بن معدان اور امام بخاری کے استاذ اسحاق بن راہویہ وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین شامل ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز ”فتاویٰ رضویہ“ میں لکھتے ہیں ”بہت اکابرین سے جماعت نوافل بالتداعی ثابت ہے اور عوامِ فعلِ خیر سے منع نہ کئے جائیں گے اور نہ نوافل سے، علمائے ملت و حکمائے ملت نے ایسی ممانعت سے منع کیا

ہے۔“ آگے ایک اور مقام پر ”حقیقہ ندیہ“ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ”اور اس قبیل سے ”صلوٰۃ الرغائب“ اور ”صلوٰۃ لیلتہ القدر“ وغیرہ باجماعت ادائیگی کو منع کرنا ہے اگرچہ علماء نے اس کی کراہت صراحت فرمائی ہے لیکن عوام کی دلچسپی کم تر ہونے کی وجہ سے اس کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔ نفل نماز باجماعت کے جواز پر علمائے متاخرین کی تصانیف موجود ہیں اور عوام کو نماز کی طرف راغب کرنا متفر کرنے سے بہتر ہے۔“

نماز عید کا خطبہ سننا

سوال:

نماز عید کے بعد جو دو خطبے دیئے جاتے ہیں، ان کے سننے کا شرعی حکم کیا ہے؟ بعض لوگ خطبہ سننے کے بجائے اٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ ﴿عبداللہ۔ گلشن اقبال، کراچی﴾

جواب:

نماز عید کے بعد دو خطبے پڑھنا اور ان کا سننا رسول اللہ ﷺ کی سنت مقدسہ ہے اور اتنی عظیم برکتوں اور سعادتوں کے دن اجر و ثواب کے طلبگاروں کو نماز کے بعد باادب بیٹھ کر خطبہ سننا چاہئے۔

تارک الصلوٰۃ کا حکم

سوال:

جو لوگ نماز جمعہ ادا نہیں کرتے اور پانچ وقت کی نمازیں نہیں پڑھتے، ان کے لئے کیا حکم ہے؟ ﴿محمد شاہد اعجاز، کراچی﴾

جواب:

اس سلسلے میں چند آیات اور احادیث مبارکہ ملاحظہ فرمائیں: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرٍ ۚ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمَصْلِيِّينَ ۚ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ ۚ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِيْنَ

ۚ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۚ حَتَّىٰ آتَانَا الْيَقِيْنَ ۚ ﴿المدثر: ۴۲ - ۴۷﴾

” (قیامت کے دن اہل جنت، جہنمیوں سے پوچھیں گے) تمہیں کیا چیز جہنم میں سے لے جانے کا باعث بنی؟“ وہ (جواباً) کہیں گے کہ ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے۔ اور ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ یہودہ لوگوں کے ساتھ یہودہ مشغلوں میں گم رہتے تھے۔ اور ہم روز جزا کو جھٹلاتے تھے۔ یہاں تک کہ ہمیں موت آ۔“

(۲) وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ط وَأَنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ ۝ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلْقُوا رَبَّهُمْ وَإِنَّهُمْ إِلَيْهِ

رَاجِعُونَ ۝ ﴿البقرة: ۴۵-۴۶﴾

”اور (اللہ کی) مدد چاہو صبر اور نماز کے ذریعے سے اور بیشک نماز ضرور دشوار محسوس ہوتی ہے، مگر (رب کی طرف) جھکنے والوں پر شاق نہیں ہے۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“

(۳) فَوَيْلٌ لِلْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ۝ ﴿الماعون: ۴-۵﴾

”پس افسوس (اور خرابی) ہے ان نمازیوں کے لئے۔ جو اپنی نمازوں سے غافل رہتے ہیں۔“

۱- حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”بندے اور کفر کے درمیان (حد فاصل) ترک نماز ہے۔“

﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم﴾

۲- عبد اللہ بن شفیق کہتے ہیں کہ اصحاب رسول اللہ ﷺ جس عمل کے ترک کو کفر (کے قریب تر) سمجھتے تھے وہ نماز ہے۔“

﴿مشکوٰۃ بحوالہ جامع ترمذی﴾

۳- حضرت ابو جعد ضمری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”جس نے سستی اور کاہلی کی بنا پر مسلسل تین جمعے چھوڑ دیئے،

اللہ تعالیٰ (سزا کے طور پر) اس کے دل پر مہر لگا دے گا (یعنی وہ اپنی اس سرکشی کی پاداش میں قبول حق کی استعداد سے محروم ہو جائے گا)۔“

﴿مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، ابن ماجہ﴾

۴- حضرت عبد اللہ بن عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو منبر پر ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ

لوگ جمعہ چھوڑنے سے باز آ جائیں، ورنہ اللہ ان کے دلوں پر (شقاوت کی) مہر لگا دے گا اور وہ غفلوں میں سے ہو جائیں گے۔“

﴿مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم﴾

ایک دکاندار یا کاروبار سے وابستہ مختلف افراد کو

باری باری مختلف مساجد میں نماز جمعہ پڑھنا

سوال:

ایک دکان میں ہم کئی افراد کام کرتے ہیں، مساجد میں نماز جمعہ کے اوقات مختلف ہوتے ہیں کہیں ایک بجے کہیں ڈیڑھ بجے، کہیں دو بجے اور کہیں ڈھائی بجے کیا ایسا کرنا جائز ہے کہ ہم دکان بند نہ کریں اور باری باری ایک ایک کر کے مختلف مساجد میں نماز جمعہ پڑھ لیں، اس طرح سب کی نماز بھی ادا ہو جاتی ہے اور کاروبار بھی چلتا رہتا ہے دکان بالکل بند نہیں کرنی پڑتی اور کیا نماز جمعہ کی دعاء ثانی کے بعد دوبارہ

﴿خرم عبد اللہ، کراچی﴾

کاروبار شروع کر سکتے ہیں؟

جواب:

ضابطے کی رو سے تو آپ کا یہ عمل درست ہوگا اور یہ فریضہ جمعہ سے عہدہ برآ ہونے اور کاروبار کو بدستور جاری رکھنے کا ایک حیلہ ہوگا اس کی ضرورت غیر مسلم ممالک میں پڑ سکتی ہے جہاں نماز جمعہ کے لئے باضابطہ کاروبار بند نہیں ہوتا بلکہ جاری رہتا ہے، وہاں رخصت کی حد تک تو یہ حیلہ درست ہوگا البتہ عزیمت کے خلاف ہوگا کیونکہ آپ میں سے ہر ایک نے اللہ تعالیٰ کے حکم ”سعی الی ذکر اللہ“ پر تو باری باری عمل کیا لیکن ”اور ہر قسم کا لین دین چھوڑ دو“ کے حکم الہی پر کلی عمل نہیں کیا بلکہ بالواسطہ طور پر آپ کا کاروبار جاری رہا یہ اس حیلہ سے مشابہ ہے جو بنی اسرائیل نے ”یوم السبت“ (ہفتے کے دن) مچھلی کے شکار کی ممانعت سے بچنے کے لئے اختیار کیا تھا کہ یا تو گھروں میں تالاب بنائے اور ان میں مچھلی لا کر ڈال دیتے اور ہفتے کے روز انہیں پکڑ کر کھانے لگے اور یاد ریاؤں سے گھروں تک نالیاں کھود دیں جن کے ذریعے مچھلیاں خود بخود گھروں کے تالابوں تک آ جاتیں اور پکڑ کر کھا لیتے یہاں بھی صورت یہ بنی کہ کاروبار بھی جاری رہا اور جمعہ کا ثواب بھی کمالیا یعنی ”ہم خرما و ہم ثواب“

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ۔

”پس جب نماز جمعہ ادا کر چکو تو زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو۔“

وہی کاروبار جو نماز جمعہ میں رکاوٹ بننے کی وجہ سے حرام تھا اب فریضہ جمعہ کی ادائیگی کے بعد اللہ کا فضل قرار پایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کریمی ہے، تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں امر وجوب کے لئے نہیں بلکہ اباحت کے لئے ہے۔

نوافل بیٹھ کر پڑھنا**سوال:**

بعض لوگ تندرست و توانا ہوتے ہوئے نوافل بیٹھ کر پڑھتے ہیں، کیا ان کا یہ عمل درست ہے؟ کیا دونوں صورتوں (یعنی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے اور بیٹھ کر نماز پڑھنے) میں ثواب یکساں ہے۔ بعض لوگ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ عشاء کے بعد دو نفل بیٹھ کر پڑھتے تھے، اس لئے ان نوافل کا بیٹھ کر پڑھنا افضل ہے؟ ﴿انور شمیم اعوان۔ قیوم آباد، کراچی﴾

جواب:

جو شخص نماز میں قیام پر قادر ہے، اس کے لئے فرض نماز بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے اگر بلا عذر بیٹھ کر پڑھے گا تو نماز ادا نہیں ہوگی۔ درمختار میں ہے جو نمازیں فرض کے ساتھ ملحق ہیں (یعنی حکماً) ان کا بھی بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے جیسے نوافل کی نذر مانی ہو تو واجب

ہو جاتے ہیں، اور صحیح ترین قول کے مطابق فجر کی دو سنتوں کا بھی یہی حکم ہے کہ بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ بعض فقہاء فجر کی سنتوں کے وجوب کے قائل ہیں، لیکن جو فقہاء فجر کی ان دو رکعت کے سنت ہونے کے قائل ہیں۔ وہ بھی جانب وجوب کی رعایت کرتے ہوئے اسی بات کے قائل ہیں کہ فجر کی سنتیں بلا عذر بیٹھ کر نہیں پڑھنی چاہیں بعض فقہاء سنت فجر پر قیاس کرتے ہوئے نماز تراویح بھی بلا عذر بیٹھ کر پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے۔ لیکن علامہ قاضی خان نے کہا ہے کہ چونکہ نماز تراویح کی تاکید سنت فجر سے کم ہے، اس لئے قول صحیح یہ ہے کہ نماز تراویح بلا عذر بھی بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں اسی طرح باقی سنتیں اور نوافل بھی بلا عذر بیٹھ کر پڑھ سکتے ہیں سوائے سنت فجر کے کہ ان کی تاکید دیگر سنتوں کے بہ نسبت زیادہ آئی ہے، لہذا یہ واجب کے قریب ہیں اور ان کا بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، لیکن بلا عذر بیٹھ کر پڑھنے والے کو کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے مقابلے میں آدھا ثواب ملے گا، البتہ اگر فرض یا واجب یا سنت یا نفل کوئی بھی نماز عذر کی بناء پر بیٹھ کر پڑھی تو ثواب میں کمی نہیں ہوگی، انشاء اللہ العزیز۔

عشاء کی نماز میں وتر کے بعد کے دونوافل کا حکم بھی وہی ہے، جو دوسرے نوافل کا ہے یعنی بلا عذر بیٹھ کر پڑھنا جائز تو ہے لیکن ثواب میں کمی ہوگی۔ جو لوگ عشاء کے وتر کے بعد دو رکعت نفل اس لئے بیٹھ کر پڑھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ایسا کرنا ثابت ہے اور اسے زیادہ باعث ثواب سمجھتے ہیں تو ان کی یہ سوچ اور یہ طرز عمل درست نہیں ہے، علامہ یحییٰ بن شرف الدین نووی شارح صحیح مسلم اور دیگر علماء نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا عشاء کے وٹروں کے بعد دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنا آپ کی خصوصیت ہے اور اس سے آپ کے ثواب میں کمی نہیں ہوتی تھی، دوسرے لوگوں کا اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ پر قیاس کرنا درست نہیں ہے، چنانچہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: ”حضرت عبد اللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث سنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، ایک دن میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا میں نے ہاتھ آپ کے سر اقدس پر رکھا، آپ نے فرمایا، اے عبد اللہ بن عمر! کیا بات ہے؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے بتایا گیا کہ آپ نے فرمایا ہے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا آدھا اجر ہوتا ہے، حالانکہ آپ خود بیٹھ کر نماز پڑھ رہے ہیں، آپ نے فرمایا، ہاں لیکن میں تم جیسا کب ہوں۔“ ﴿رقم الحدیث: ۱۶۱۲﴾

سورۃ فاتحہ کی آیت کا چھوٹ جانا؟

سوال:

اگر امام سے نماز میں دوران قرأت سورۃ فاتحہ کی کوئی آیت بھولے سے رہ جائے تو کیا نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

﴿مستقیم، پی ای سی ایچ ایس۔ کراچی﴾

جواب :

سورہ فاتحہ مکمل نماز میں پڑھنا واجب ہے، لہذا کوئی ایک کلمہ بھی پڑھنے سے رہ جائے تو سجدہ سہولاً لازم آئے گا اور اگر نماز کے اندر سجدہ سہونہ کیا تو نماز کا اعادہ لازم آئے گا۔

نماز باجماعت میں دعاء قنوت کا رہ جانا

سوال :

باجماعت وتر کی ادائیگی کے دوران اگر کسی سے دعاء قنوت رہ جائے تو کیا اکیلے سجدہ سہو کر سکتا ہے؟ ﴿زیتون میمن۔ کلفٹن﴾

جواب :

باجماعت وتر کی ادائیگی کے دوران اگر امام دعاء قنوت پڑھنا بھول جائے اور تکبیر کہتے ہوئے سیدھا رکوع میں چلا جائے تو امام اور اس کی متابعت میں سب مقتدی بھی سجدہ سہو ادا کریں گے اور نماز صحیح طور پر ادا ہو جائے گی۔ اگر امام کی اقتداء کے دوران صرف مقتدی دعاء قنوت پڑھنا بھول جائے تو اس پر سجدہ سہولاً لازم نہیں ہے، نہ وہ جماعت کے اندر ادا کرے گا اور نہ اکیلے، انشاء اللہ جماعت کی برکت سے اس کی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

بیت اللہ کی طرف سجدہ کرنے اور حجر اسود کو بوسہ دینے پر صہیونیوں کا اعتراض

سوال :

عرض یہ ہے کہ آج کل صہیونی قوتوں خصوصاً ہندوؤں کی جانب سے یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔ مسلمان دوسروں کو توبت پرستی سے روکتے ہیں، پتھر کے خداؤں کی پوجا کرنے سے منع کرتے ہیں، مگر خود پتھر کی ایک عمارت (خانہ کعبہ) کو سجدہ کرتے ہیں، اس طرح تو مسلمان خود بھی بت پرستی کرتے ہیں (العیاذ باللہ)، ایک اور شوشہ یہ بھی چھوڑا جا رہا ہے کہ بتوں کو بوسہ دینے کی مخالفت کرنے والے مسلمان خود ایک پتھر کو بوسہ دیتے ہیں اور بت پرستی کرتے ہیں (العیاذ باللہ) نیز اس طرح کے کئی اور فضول، بکواس اور گھٹیا حربے استعمال کر کے مسلمان قوم کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جا رہی ہے گو کہ ہم لوگ ان لغو باتوں پر دھیان نہیں دیتے اور اپنی طرف سے ان کافروں کو منہ توڑ جواب دیتے ہیں مگر دوسروں کو مطمئن کرنے کے لئے علمی جواب ضروری ہے۔

﴿محمد احسن سمیع۔ نارتھ ناظم آباد، کراچی﴾

جواب:

مشرك بتوں کو سجدہ کرتے ہیں اور بت ہی ان کے معبود اور مسجود ہوتے ہیں، جبکہ مسلمان بیت اللہ کو سجدہ نہیں کرتے۔ کعبہ مسلمانوں کا معبود اور مسجود نہیں ہے نہ ہی مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بیت اللہ یا خانہ کعبہ ایسا مقام یا جگہ ہے جہاں معاذ اللہ! اللہ تعالیٰ قیام پذیر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ زمان و مکان کے اندر محدود یا مقید ہونا یہ عالم اجسام اور مادی دنیا کی صفات ہیں، اللہ کی ذات اس سے بلند تر ہے، چنانچہ جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں تو قرآن نے منکرین کے اعتراضات کا ازالہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ط ﴿البقرة: ۱۴۲﴾

”اب بیوقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو ان کے سابقہ قبلے سے کس چیز نے پھیر دیا؟ (اے رسول!) آپ فرمادیجئے کہ مشرق و مغرب اللہ ہی کے ہیں۔“

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَآيِنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهَ اللّٰهِ ط ﴿البقرة: ۱۱۵﴾

”اور مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، تو جہاں کہیں تم (قبلے کی طرف) منہ کرو، وہیں اللہ (کی رحمت تمہاری طرف) متوجہ ہے۔“

اور ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا وُجُوْهُكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيِّنَ ۚ وَاتٰى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوٰى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۚ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتٰى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبُسَاۗءِ وَالضَّرَآءِ وَحِيْنَ الْبَاسِ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

﴿البقرة: ۱۷۷﴾

” (اصل) نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا رخ مشرق و مغرب کی جانب پھیر لو، بلکہ (اصل) نیکی اس شخص کی ہے جو اللہ، قیامت کے دن، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان لائے اور مال کی محبت کے باوجود رشتہ داروں، یتیموں، ناداروں، مسافروں، سائلین (اور قرض میں پھنسے ہوئے یا غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے لوگوں کی) گلو خلاصی کے لئے (اللہ کی رضا کی خاطر) مال دے اور نماز قائم کرے زکوٰۃ دے، اور اپنے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنے والے ہوں اور حالت تکلیف و سختی میں کافروں سے لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جو (اپنے دعوئے ایمان میں) سچے ثابت ہوئے اور (درحقیقت) یہی لوگ متقی ہیں۔“

تو کعبہ ہمارا مسجد نہیں بلکہ جہتِ سجدہ ہے۔ ہم کعبے کو نہیں، بلکہ جانبِ کعبہ سجدہ کرتے ہیں، عبادتِ کعبہ کی نہیں کرتے بلکہ ربِ کعبہ کی کرتے ہیں، اگر سجدہ کعبے کو ہوتا تو صرف اس کے سامنے ہی ہوتا جیسے بت پرست مشرک بت کے سامنے جھک کر اسے سجدہ کرتے ہیں، سینکڑوں ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے، جبکہ درمیان میں ہزاروں رکاوٹیں اور حجابات حائل ہوتے ہیں کعبے کو سجدہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے ہر نمازی کا ایسے زاویے پر کھڑا ہونا کہ نوے درجے کا خطِ مستقیم بنتے ہوئے کعبہ عین اس کی پیشانی کے سامنے واقع ہو رہا ہو اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین امر ضرور ہے، اس لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ نمازی اپنی طرف سے پوری ذہنی و فکری کوشش صرف کر کے یا کسی صاحبِ علم سے پوچھ کر قبلے کا تعین کر کے نماز پڑھ لے، اس کو اصطلاحِ فقہ میں ”تحری“ کہتے ہیں۔ اگر انتہائی کوشش کے باوجود فی الواقع اس کا رخ قبلے سے ہٹ گیا ہو اور یہ انحراف ۴۵ درجے تک ہو جائے تب بھی نماز صحیح ادا ہو جائے گی۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس میں باری تعالیٰ کی کیا حکمت ہے کہ بیت اللہ کی جانب رخ کر کے عبادت کا حکم فرمایا جبکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم تو ہر جہت اور جگہ کو محیط ہے۔ تو اس کی حکمت جو میری ناقص عقل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا مرکزِ عبادت اور جہتِ نماز بنا کر ایک بے مثال وحدت قائم فرمادی، اور خانہ کعبہ کو اپنی برکات اور انوار و تجلیات کا مرکز و محور بنا دیا تاکہ وہ اس کی برکات سے فیض یاب ہو سکیں اور اسے مسلمانوں کا شعار اور امتیازی نشان بنادیا، چنانچہ حدیثِ پاک میں ہے: ”حضرت انس بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو ہماری طرح نماز پڑھے اور (نماز میں) ہمارے قبلے کی جانب رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، تو وہ شخص مسلم ہے، پس اللہ تعالیٰ کے (عطا کردہ) عہد امان کو نہ توڑو (یعنی اس کی جان، مال اور آبرو کی حرمت کو پامال نہ کرو)۔“ ﴿مشکوٰۃ، بحوالہ صحیح بخاری﴾

حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی بابت یہ حدیث ملاحظہ فرمائیے: ”عبداللہ بن سر جس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حجرِ اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے، بخدا میں تجھے بوسہ دے رہا ہوں، حالانکہ میں خوب جانتا ہوں تو ایک پتھر ہے، تو (اپنی ذات سے) نہ نفع دیتا ہے نہ نقصان اور اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔“

﴿صحیح مسلم، رقم الحدیث ۲۹۶۵﴾

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب جنت سے حجرِ اسود کو اتارا گیا تو یہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، لیکن بنی آدم کے گناہوں نے اسے سیاہ کر دیا۔ تو حجرِ اسود کو، حصولِ خیر و برکت کے لئے اور سنتِ رسول ﷺ کی اتباع میں بوسہ دیا جاتا ہے۔ محض بوسہ دینا کسی بھی مذہب میں عبادت نہیں ہے۔ کبھی تعظیم و توقیر کے طور پر بوسہ دیا جاتا ہے جیسے حجرِ اسود کو کبھی حصولِ برکت کے لئے بوسہ دیا جاتا ہے جیسے بزرگوں اور والدین کی دست بوسی اور قدم بوسی اور آثارِ صالحین کو بوسہ دینا۔ کبھی اظہارِ شفقت و محبت کے طور پر بوسہ دیا جاتا ہے جیسے بزرگ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں۔ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ حجرِ اسود اپنی ذات سے فیض رساں ہے، ذاتی کمالات صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہیں، مخلوق میں جو بھی کمال ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور تخلیق سے ہے۔

مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو دانستہ بم سے اڑانے والوں کا شرعی حکم

سوال:

اہل سنت کی ایک جامع مسجد پر بعض دوسرے مکتبہ فکر کے لوگ قبضہ کرنا چاہتے تھے اس ناپاک مہم میں ناکامی کے بعد انہوں نے مسجد اور اس سے ملحقہ مدرسے کو بم سے اڑا دیا۔ ازراہ کرم شریعت مطہرہ کی روشنی میں ایسے لوگوں کا جو مسجد کو شہید کر دیں اور اس پر ناپاک قبضہ جمانے کی سازشیں کریں کیا حکم ہے؟ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلقات میل جول شادی بیاہ کی کیا حیثیت ہوگی۔ یہ واضح رہے کہ مذکورہ جامع مسجد علاقہ کی واحد جامع مسجد ہے۔

﴿قاری محمد سیف اللہ۔ نیریاں شریف آزاد کشمیر﴾

جواب:

سورۃ التوبہ آیات ۱۷-۱۸ میں اللہ جل شانہ کا ارشاد ہے:

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ أُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُونَ ۝ إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسْجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَحْشَ إِلَّا لِلَّهِ ۚ فَكَفَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۝

﴿التوبہ: ۱۷ - ۱۸﴾

”مشرکوں کا یہ وتیرہ ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں حالانکہ وہ خود اپنی ذات پر کفر کے گواہ ہیں، وہ ایسے لوگ ہیں جن کے عمل ضائع ہو گئے اور ہمیشہ دوزخ ہی میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدیں تو وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لائے اور انہوں نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی اور اللہ کے سوا کسی سے خائف نہیں ہوئے تو وہ لوگ اس کے قریب ہیں کہ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں۔

اور سورۃ البقرہ آیت: ۱۴۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ أَنْ يُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ

”اور اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی مسجدوں میں اس کے مقدس نام کے ذکر سے روکا اور ان کو ویران کرنے کی کوشش کی۔“

”عمارة المسجد“ سے مراد مسجدیں تعمیر بھی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اقامتِ صلوٰۃ کے ذریعے انہیں آباد بھی کرنا ہے اور قرآن نے بتایا کہ یہ مومنین صادقین کا شعار ہے نہ کہ مشرکین و کفار کا، اور قرآن نے یہ بھی بتایا کہ مساجد میں اللہ کے ذکر سے روکنے والے اور انہیں

ویران کرنے والے لश्قی اور ظالم ترین لوگ ہیں۔

مساجد کو ویران کرنے کی کئی صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ مسجد کی عمارت توقائم و دائم رہے لیکن ذاکرین اور نمازیوں کو اس میں ذکر و عبادت سے روک دیا جائے، جیسے مشرکین مکہ کا وتیرہ تھا اور بیعت رضوان کے موقع پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ میں آنے، عمرہ ادا کرنے اور عبادت و ذکر الہی سے روک دیا تھا۔
(۲) امام قرطبی مالکی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس کی ایک صورت یہ بیان کی ہے کہ بد نیتی سے کسی مسجد کے متصل یا قریب ترین دوسری مسجد محض اس لئے بنائی جائے کہ وہ مسجد ویران اور غیر آباد ہو جائے اور ذاکرین، مصلیان سے خالی ہو جائے جیسے ”منافقین مدینہ“ نے مسجد ضرار بنائی تھی۔

(۳) یہ کہ سرے سے مسجد کو خدا نخواستہ شہید کر دیا جائے اور مسمار کر دیا جائے، یہ ظالم ترین اور لश्قی القلب لوگوں ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ جیسے نصاریٰ نے بخت نصر بابل مشرک کے ساتھ مل کر یہود کی عداوت میں ”بیت المقدس“ کو مسمار کر لیا تھا اور اسے مردار خانے اور کوڑے اور گندگی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا تھا۔ العیاذ باللہ! اسی طرح ماضی قریب میں ہندوستان میں ہندوؤں نے باہری مسجد کو شہید کیا، کشمیر میں درگاہ حضرت بل کو شہید کیا، یہود نے بیت المقدس کو آگ لگانے کی مذموم کوشش کی اور اب حال ہی میں استفتاء میں درج صورتحال کے مطابق آزاد کشمیر کے علاقہ ڈنہ پوٹھی میر خان میں مسجد کو بم سے اڑا دیا۔

ایک اسلامی مملکت میں ایسے واقعات کا رونما ہونا انتہائی سنگین، اندوہناک اور المناک حادثہ ہے، یہ شعائر اللہ کی صریح توہین ہے، اور اگر متعلقہ حکومت نے ایسے لوگوں کی نشاندہی کر کے انہیں گرفتار کر کے قرار واقعی سزا نہ دی تو وہ بھی عند اللہ مسئول ہوں گے۔ یہ فعل حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ قرآن کی وعید اس پر شاہد ہے چونکہ ان لوگوں نے ”علی رؤس الاشہاد“ یعنی علانیہ طور پر یہ جرم قبیح کیا ہے اس لئے جن لوگوں نے مسلمانوں کی مسجد کو شہید کیا ہے ان پر ضروری ہے کہ توبہ کریں اور توبہ کی شرط یہ ہے کہ:

(۱) اظہارِ ندامت کیا جائے۔

(۲) آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم مصمم کیا جائے۔

(۳) جو کچھ کیا ہے اس کا تدارک اور تلافی کی جائے، اس لئے ان لوگوں کی توبہ اس وقت صحیح ہوگی جب یہ لوگ اس مسجد کو پہلے کی طرح بنادیں ورنہ صرف زبانی اظہارِ ندامت سے ان کی توبہ نہیں ہوگی اور جب تک یہ لوگ درج بالا شرائط کے مطابق توبہ نہ کریں مسلمان ان سے میل جول اور کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَرَکُنُوْا اِلَی الدِّیْنِ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ۔ ﴿ہود: ۱۱۳﴾

”اور تم ظالموں سے میل جول نہ رکھو ورنہ تم کو بھی آگ جلائے گی۔“

یعنی قرآن نے تو ان کو ظالم کہا ہے اور دعائے قنوت میں ہے:

”جو تیری نافرمانی کرتا ہے ہم اس سے ترک تعلق کرتے ہیں۔“ یہ حکم اس صورت میں ہے جب انہوں نے گناہ سمجھ کر یہ فتنہ کام کیا اور اگر اس کو جائز اور حلال سمجھ کر کیا ہے تو پھر ان کا ایمان جاتا رہا اور وہ مرتد ہو گئے اور ان کا نکاح باطل ہو گیا اور ان پر اس فتنہ فعل سے براءت کا اظہار کر کے تجدید ایمان اور تجدید نکاح لازم ہے۔

قرآن اور تلاوت قرآن کے آداب

سوال:

آج تقریباً ہر اخبار، رسالے اور کتاب میں آیات قرآنی درج ہوتی ہیں، ماشاء اللہ تعلیم القرآن اور حفظ القرآن کا ذوق بھی فروغ پا رہا ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا ادب اٹھتا جا رہا ہے، اس لئے وہ روحانیت اور برکت پیدا نہیں ہوتی جو تعظیم قرآن کا تقاضا ہے، ازراہ کرم اپنے کالم میں قرآن اور تلاوت قرآن کے آداب پر روشنی ڈالیں، شاید کسی کے دل میں بات اتر جائے۔

﴿مولانا علی عمران صدیقی۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی﴾

جواب:

قرآن، کلام ربانی اور انسانیت کے لئے تابعد صحیفہ ہدایت ہے۔ لیکن یہ محض ایک قانون کی کتاب نہیں ہے، بلکہ یہ کتاب الہی انتہائی مقدس و محترم ہے۔ اسی لئے اللہ جل شانہ نے تعلیم کتاب و حکمت کے ساتھ ساتھ تلاوت قرآن کو بھی ایک مستقل فریضہ نبوت قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴿الجمعه : ۲﴾

”اللہ وہ ہے جس نے اُمی لوگوں کے درمیان انہی میں سے ایک عظیم رسول کو مبعوث فرمایا، جو ان پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور ان (کے قلوب) کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

اور فرمایا:

وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلاً ﴿المزمل : ۴﴾

”اور قرآن کو ٹھہراؤ کے ساتھ پڑھئے۔“

اس لئے تلاوت قرآن ایک مستقل سعادت و عبادت ہے۔ جب کوئی مومن قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ کرے تو اپنے منہ کو ہر قسم

کی بدبو (پان، نسوار، تمباکو، لہسن و پیاز وغیرہ کے اثرات) سے پاک کر کے کسی پاک و صاف جگہ با وضو، با ادب قبلہ رو بیٹھ کر تلاوت کرے، ہو سکے تو خوشبو بھی استعمال کرے، اگرچہ بے وضو تلاوت کرنا جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ اگر تنہا ہو تو اونچی آواز سے تلاوت کرے، لیکن اگر مسجد میں اور لوگ بھی ہوں جو نماز، تلاوت اور ادا و اذکار میں مشغول ہوں یا گھر پر دنیوی کام کاج میں مشغول ہوں تو پھر آہستہ پڑھے، اجتماعی قرآن خوانی ہو رہی ہو تو بھی آہستہ پڑھیں۔ تلاوتِ قرآن کے دوران ادھر ادھر نہ دیکھے بلکہ مصحف شریف پر نظر رکھے، کیونکہ قرآن کو دیکھنا بھی عبادت ہے، یہی وجہ ہے کہ دیکھ کر پڑھنے کا اجر زبانی پڑھنے سے زیادہ ہے، بے وضو قرآن کو چھونا نہیں چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ ﴿۷۹﴾ الواقعة : ۷۹ ﴿﴾

”اس کو پاکیزہ افراد ہی چھوتے ہیں۔“

حائض و نفاس والی عورت اور جنبی مرد (یعنی جن پر غسل واجب ہے یا جو ابھی پاک نہیں ہوئے) کے لئے قرآن پاک کو چھونا اور پڑھنا منع ہے، حائض عورت اگر معلّمہ ہے تو چھوئے بغیر قرآن کے کلمات کو روانی کے بجائے الگ الگ کر کے بچوں کو پڑھائے۔ حائض اور جنبی قرآن کی کوئی آیت بطور دعا پڑھ سکتے ہیں، جیسے شکر کے موقع پر کوئی کہے: ”الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ“ اسی طرح ان کے لئے کلمات تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر اور درود شریف پڑھنا جائز ہے۔ استنجا خانے، اٹیچڈ باتھ روم اور کسی بھی بے توقیر جگہ پر قرآن پڑھنا خلافِ ادب ہے۔ تلاوت شروع کرنے سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھے۔ اگر کوئی عورت مستحاضہ ہے (یعنی اس کا خون جاری رہتا ہے) یا کسی کو پیشاب کے قطرے ٹپکتے رہنے یا دائمی نکسیر یا کسی زخم سے خون یا پیپ رستے رہنے یا مسلسل غلبہٴ ریح کی شکایت ہے تو ایسے لوگ شرعاً معذور ہیں، یہ لوگ ایک نماز کے وقت کے لئے جب وضو کریں تو دوسری نماز کا وقت داخل ہونے تک ان شکایات کے جاری رہنے کے باوجود مسلسل نماز پڑھ سکتے ہیں اور تلاوت کر سکتے ہیں۔

قصداً قرآن کی توہین کفر ہے، لیکن اگر غیر ارادی طور پر غلطی سے یا بے خیالی میں قرآن مجید گر جائے تو اس کا کوئی مالی کفارہ نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں، اللہ معاف فرمانے والا ہے۔ قرآن کی طرف پاؤں کر کے بیٹھنا یا سونا خلافِ ادب ہے لیکن اگر قرآن قدموں کی جانب کسی الماری میں بند ہے یا بالائی طاق پر ہے تو کوئی جرم نہیں ہے۔ قرآن کو ترتیبِ مصحف کے مطابق پڑھنا چاہئے، خلافِ ترتیب پڑھنا منع ہے، لیکن اگر نماز میں بھول کر پڑھ لیں تو سجدہٴ سہو نہیں ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کرنا سنت و مستحب ہے، البتہ اگر تلاوت ہو رہی ہو تو اس کا سننا واجب ہے۔ اگر متعدد کتب ہوں تو سب سے اوپر قرآن مجید، پھر تفسیر، پھر حدیث، پھر سیرت و فقہ اور دوسری کتب نیچے رکھیں۔

نماز کے اندر قرأت میں غلطی کا مسئلہ

سوال:

ایک امام صاحب مغرب کی نماز پڑھا رہے تھے، انہوں نے ”سورة القارعه“ کی قرأت شروع کی، جب ”فامامن ثقلت موازینہ“ تک پہنچے تو اس کے بعد کی دو آیات بھول گئے اور ان سے آگے والی آیت ”فامه هاوية“ پڑھ لی۔ امام صاحب نے نماز مکمل کر کے سلام پھیر دیا، اور سجدہ سہو نہیں کیا۔ کیا نماز صحیح طور پر ادا ہو گئی؟ ﴿محمد آصف۔ اورنگی ٹاؤن، کراچی﴾

جواب:

جی ہاں نماز صحیح طور پر ادا ہو گئی، کیونکہ مقدار واجب قرأت ادا ہو گئی، نہ کوئی اعراب کی غلطی ہوئی اور نہ ہی قرأت میں ایسے لفظوں کا اضافہ ہوا، جو قرآن کا حصہ نہ تھے۔ بس درمیان سے دو آیتیں رہ گئیں، باقی جو کچھ پڑھا وہ قرآن ہی ہے۔ فقہاء کرام نے قرأت میں ایسی غلطی، جس کی وجہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، کا ضابطہ یہ بیان کیا ہے کہ بھولنے کے بجائے اگر وہ دانستہ طور پر اس طرح پڑھے تو کفر لازم آجائے۔

فتاویٰ عالمگیری جلد نمبر 1، صفحہ نمبر 81 پر قراءت کی چند فاحش غلطیوں کا بطور مثال ذکر کرنے کے بعد لکھا:

وما اشبه ذالك مما له لو تعمد به يكفر اذا قرأ خطأ فسدت صلوته، في قول المتقدمين۔

”اور ان جیسی غلطیاں کہ اگر وہ قصداً اس طرح پڑھتا تو اس کی تکفیر لازم آتی، اگر ان کو غلطی سے پڑھ لے تو متقدمین فقہاء کرام کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔“

آگے چل کر لکھا: ”اور متقدمین کا فساد نماز (اور اعادہ نماز) کے بارے میں یہ قول زیادہ احتیاط پر مبنی ہے۔“ یہی فقہی ضابطہ ”فتاویٰ شامی“، ”فتاویٰ خانہ“ اور دیگر کتب فقہ میں بھی مذکور ہے۔ اس کے برعکس متاخرین فقہاء کرام نے کہا کہ چونکہ عام مسلمانوں سے اعراب کی غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں، وہ اعراب یا الفاظ کی ایسی غلطیوں پر اکثر مطلع بھی نہیں ہوتے، اور اگر اعراب کی غلطیوں پر مطلع ہو جائیں تو معنی کے فاسد ہونے کا انہیں علم نہیں ہوتا اس لیے عموم بلوی (یعنی لوگوں کے کثرت سے اس میں مبتلا ہونے) کی وجہ سے نماز ادا ہو جاتی ہے۔ تاہم جب نماز کے فاسد ہونے کی وجہ معلوم ہو جائے تو احتیاط پر عمل کرتے ہوئے نماز کا دہرانا ہی بہتر ہے۔

مستحب پرد وام

سوال:

بعض لوگ عبادات میں مستحبات پر اتنا التزام کرتے ہیں، اتنا زور دیتے ہیں اور اتنا اہتمام و دوام کرتے ہیں کہ لگتا ہے انہیں فرض یا واجب کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ کیا ان لوگوں کا یہ رویہ اور طرز عمل درست ہے۔ ﴿سید عمران علی، بلد یہ ٹاؤن، کراچی﴾

جواب:

ہر معقول شخص اپنے لباس، وضع قطع، رہن سہن، اکل و شرب اور بود و باش میں ترتیب، تزئین اور تحسین کو پسند کرتا ہے اور یہ فطرتِ سلیم کا تقاضا بھی ہے، بشرطیکہ یہ وجوہ تحسین و تزئین شریعت کے دائرے میں ہوں اور اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقررہ حدود کے اندر ہوں۔ اسی طرح عبادات اور اعمالِ دینیہ میں بھی بعض امور وجوہ تحسین میں شمار ہوتے ہیں، انہیں آداب و مستحبات کہا جاتا ہے اور ان کا درجہ فرائض، واجبات اور سنن کے بعد آتا ہے۔ ان کے اہتمام سے عبادت کی اعلیٰ معیار پر تکمیل ہوتی ہے اور اس میں روحانی اور معنوی حسن پیدا ہوتا ہے، مثلاً آپ نماز پڑھیں تو حالتِ قیام میں نگاہیں مقامِ سجدہ پر مرکوز رکھیں، لباس اور بدن کے ساتھ نہ کھیلیں، اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضوری کا تصور طاری کریں تاکہ دل میں خشیتِ الہی پیدا ہو اور ذہن نماز سے کسی اور چیز کی طرف منتقل ہی نہ ہو۔ نماز کے انتظار میں باادب صف بستہ ہو کر بیٹھیں اور جب اقامت کہی جائے تو ”حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح“ پر کھڑے ہو جائیں۔ اگر بھوک کی شدید خواہش یا پیشاب کی حاجت ستارہی ہے تو ان حاجات کی تکمیل کر کے نماز شروع کریں، بشرطیکہ وقت میں گنجائش ہوتا کہ نماز میں یکسوئی نصیب ہو، وغیرہ۔

مستحب کے معنی ہیں ”پسندیدہ بات“، ”دل پسند چیز“، ایک روایت میں آیا ہے کہ: ”(صحیح العقیدہ و سلیم الفطرت)“ ”مسلمان جس چیز کو پسندیدہ اور اچھی سمجھیں، اسے اللہ تعالیٰ بھی پسند فرماتا ہے۔“ اعمالِ حسنہ میں دوام و ہمیشگی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، حدیث پاک میں ہے: ”جن اعمال کو دوام اور پابندی کے ساتھ کیا جائے، وہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں، خواہ وہ مقدار میں کم ہی کیوں نہ ہوں۔“ لہذا اگر کوئی شخص یا افراد عبادات و اعمال اور اطوار حیات میں آداب و مستحبات کا اہتمام و التزام کرتے ہیں اور انہیں ہمیشہ پابندی کے ساتھ کرتے ہیں، تو یہ روش ایسی ہے، جس کی تحسین (Appreciation) کی جانی چاہئے تاکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب ہو، نہ کہ اسے نشانہ بنایا جائے، بشرطیکہ کوئی اسے فرض و واجب سمجھ کر نہ کر رہا ہو۔

البتہ اگر کوئی شخص ”آداب و مستحبات“ میں کسی امرِ مستحب پر اپنے کسی عذر، مصروفیت یا مجبوری کی بناء پر عمل نہیں کرتا، تو ترکِ مستحب پر اسے ملامت نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ ترکِ مستحب پر ملامت کرنا، اسے فرض یا واجب قرار دینے کے مترادف ہے اور یہ ہمارا منصب نہیں،

شارع کا منصب ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ کوئی شخص کسی امر مستحب کو حقیر سمجھ کر نہ چھوڑے، یہ روش قلبی شقاوت کا مظہر ہوگی، کم ہمتی سے چھوڑنا الگ بات ہے۔ بہر کیف اسلام ایک متوازن اور معتدل دین ہے، ہمیں افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال و توازن پر کاربند رہنا چاہئے، یہی عادت اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

مسجد نبوی ﷺ میں چالیس نمازوں کی فضیلت

سوال:

ایک حدیث نبوی کا مفہوم مشہور ہے کہ جس نے میری مسجد میں چالیس نمازیں ادا کیں، اس پر میری شفاعت واجب ہے، اس حدیث کا حوالہ بیان فرمائیں۔“
﴿عبدالحیٰ انصاری، فیڈرل بی ایریا، کراچی﴾

جواب:

حضرت امام احمد بن حنبل نے اپنی سند کے ساتھ حضرت انس بن مالک سے مندرجہ ذیل حدیث بیان فرمائی ہے:

عن انس بن مالک عن النبی ﷺ انه قال من صلی فی مسجدی اربعین صلوٰۃ لا یفوته صلوٰۃ کتبت له براءة من

النار ونجاة من العذاب و برئ من النفاق۔ ﴿مسند امام احمد بن حنبل، ج ۳، ص ۱۵۵﴾

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”جس شخص نے میری مسجد میں چالیس نمازیں (اس تسلسل کے ساتھ) پڑھیں کہ اس کی ایک بھی نماز فوت نہ ہوئی ہو، تو اس کے لیے جہنم سے آزادی، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت (کا پروانہ) لکھ دیا جائے گا۔“

اس حدیث مبارک کی رو سے مسجد نبوی میں چالیس نمازیں مسلسل پڑھنے کا بڑا اجر ہے اور اس کے لیے نار جہنم سے براءت، عذاب سے نجات اور نفاق سے براءت کی ضمانت ہے۔

اور چالیس کے عدد میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض برکات ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما من رجل مسلم یموت فیکوم علی جنازته اربعون رجلاً لا یشرکون باللہ شیئاً الا شفّعهم اللہ فیہ۔

﴿صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ، باب المشی بالجنازة والصلوة علیہا﴾

جب کوئی مسلمان وفات پا جائے اور اس کی نماز جنازہ میں ایسے چالیس افراد شریک ہوں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ

ٹھہراتے ہوں تو اللہ تعالیٰ اس (میت) کے حق میں ان کی شفاعت قبول فرمائے گا۔“

امام یحییٰ بن شرف الدین نووی نے ”اربعین النووی“ میں حضرات علی، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل، ابوالدرداء ابن عمر، ابن عباس، انس بن مالک، ابو ہریرہ اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم سے کئی طریقوں سے، مختلف قسم کی روایات میں بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

من حفظ علی امتی اربعین حدیثاً من امر دینہا بعثہ اللہ یوم القیمة فی زمرة الفقہاء و العلماء، و فی رواية ”بعثہ اللہ فقیہا عالمًا“ و فی رواية ابی الدرداء: و كنت له یوم القیمة شافعاً و شهیداً، و فی رواية ابن مسعود: قيل له، ادخل من ای ابواب الجنة شئت۔

”جو میری امت کے لیے اس کے دینی امور سے متعلق چالیس حدیثیں یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے فقہاء و علماء کی جماعت میں اٹھائے گا، ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ اسے فقیہ عالم اٹھائے گا، ابوالدرداء کی روایت میں ہے: میں قیامت کے دن اس کی شفاعت کرنے والا اور گواہ ہوں گا اور ابن مسعود کی روایت میں ہے: اس سے کہا جائے گا تم جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جاؤ، وغیرہ۔“

یہ روایت اگرچہ ضعیف ہے، لیکن فضائل اعمال میں ضعیف احادیث بھی معتبر ہوتی ہیں۔

سلام پڑھنے کی منت

سوال:

زید نے منت مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں ایک لاکھ مرتبہ سلام پڑھوں گا، اب کام ہو جانے کے بعد زید نے پڑھا کہ ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ صرف اتنا پڑھ کر زید اپنی منت سے بری ہو جائے گا یا نہیں۔ جیسے زید کہے کہ میں تین مرتبہ سبحان اللہ کہتا ہوں، تو یہ تین مرتبہ ہو گا یا ایک مرتبہ۔ ﴿محمد علی قادری، فیڈرل بی ایریا، کراچی﴾

جواب:

شرعاً کسی بندہ مومن کا ایک ایسی عبادت مقصودہ (جیسے نماز، صدقہ وغیرہ) کو اپنے اوپر لازم کرنا، جسے شارع نے اس پر بطور (فرض یا واجب) لازم نہیں کیا، نذر کہلاتا ہے۔ نذر کی مشروعیت اور اس کا لزوم قرآن و سنت سے ثابت ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جس چیز یا بات کی نذر مانی جا رہی ہے اس کی جنس سے کوئی عبادت شارع کی طرف سے فرض یا واجب ہو، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ شرعاً اگرچہ نذر کا پورا کرنا واجب ہے لیکن نذر ماننا پسندیدہ اور مستحسن بات نہیں ہے، حدیث شریف میں ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: لَا تَنْذِرُوا فَإِنَّ النَّذْرَ لَا يَغْنَى مِنَ الْقَدَرِ شَيْئًا وَانْمَا يَسْتَخْرِجُ بِهِ مِنَ

البخيل۔ ﴿صحیح مسلم، رقم الحدیث ۱۴۲۸﴾

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”نذر مت مانا کرو، کیونکہ نذر تقدیر کو ٹال نہیں سکتی، یہ صرف بخیل سے مال نکالنے کا ذریعہ ہے۔“

اس حدیث مبارک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شرعاً نذر ماننا منع ہے اور معصیت ہے بلکہ اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں، مثلاً

(۱) یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا معاملہ کرنا بندگی کے شایانِ شان نہیں ہے کہ بندہ اپنے خالق و مالک سے یہ کہے کہ اے اللہ!

اگر میرا یہ کام بن گیا تو اتنے نوافل پڑھوں گا یا اتنا صدقہ دوں گا یا اتنے روزے رکھوں گا، اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ خدا نخواستہ کام نہ بنا تو میں یہ سب کچھ نہیں کروں گا۔ یہ اندازِ فکر مقامِ بندگی کو زیب نہیں دیتا بلکہ کمالِ بندگی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ توفیق سے جو عملِ خیر اپنے رب کے حضور نذرانہِ بندگی کے طور پر پیش کر سکتا ہے، کر لے اور پھر اس عملِ خیر کے صدقے، وسیلے اور برکت سے اپنی حاجت روائی کے لیے اللہ سے دعاء مانگے۔ یہ طرزِ عمل نذر ماننے کے بہ نسبت اعلیٰ واولیٰ ہے۔

(ب) یہ کہ یہ اعتقاد نہ رکھے کہ نذر اللہ کی تقدیر کو بدل دے گی، بلکہ اسے بھی ”تقدیر معلق“ کے طور پر تابعِ تقدیر سمجھے اور جس طرح

دنیا میں ظاہری طور پر ہم نتائج کی نسبت اسباب کی طرف کرتے ہیں کیونکہ یہ عالم اسباب ہے، مثلاً فلاں طبیب یا فلاں دوا سے مجھے شفاء ملی، لیکن ہمارا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب تو ایک ظاہری وسیلہ ہیں ورنہ معاملات و امور کے وجود میں آنے میں مؤثر بالذات اللہ کی مشیت ہے، یہی عقیدہ نذر کے بارے میں بھی ہونا چاہئے۔

(ج) یہ کہ یہ نذر ماننے کے بعد اس کے پورا نہ کرنے میں سستی اور غفلت و کوتاہی پر وعید ہے۔

رسول اللہ ﷺ پر سلام چونکہ تشہد (یعنی نماز میں التحیات) کا جزء لازم ہونے کی بنا پر واجب ہے اور فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ

آیت درود (سورۃ احزاب کی آیت نمبر ۵۶) کی رو سے کم از کم ایک بار زندگی میں صلوٰۃ و سلام پڑھنا فرض ہے، لہذا اس کی نذر ماننا بھی جائز ہے اور اس کی تعمیل واجب ہے۔

لیکن ”مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام“ پڑھنے سے صرف ایک بار سلام شمار ہوگا۔ ایک لاکھ بار نہیں، جیسے کوئی یہ کہے کہ ”سبحان

اللہ مائة مرة“ (یعنی سو بار سبحان اللہ) تو ایک بار سبحان اللہ کہنے کا ثواب ملے گا۔ علامہ علاؤ الدین ہسکفی لکھتے ہیں:

ولو نذر ان یصلی علی النبی ﷺ کل یوم کذا لزمہ و قیل لا۔

”اور اگر کسی نے نذر مانی کہ وہ ہر روز نبی ﷺ پر اتنی بار درود پڑھے گا (یعنی تعداد معین کی)، تو اس پر اس نذر کو پورا کرنا لازم ہے

اور ایک قول یہ ہے کہ لازم نہیں۔“

یعنی قول مختار یہی ہے کہ درود و سلام کی نذر کا پورا کرنا لازم ہے اور عدم لزوم کا قول ضعیف اور غیر مختار ہے، تاہم اس کی توجیہ میں علامہ ابن عابدین شامی، حموی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

(و قيل لا) لعل وجهه اشتراط كون الفرض قطعياً۔

﴿رد المحتار علی الدر المختار، جلد ۵ صفحہ ۴۱۶، طبع جدید﴾

”یعنی اسی نذر کے پورا کرنے کا عدم لزوم ان کے نزدیک ہوگا جن کے نزدیک نذر کے لیے شرط یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی عبادت فرض قطعی ہو، (لیکن مختار یہ ہے کہ اس کی جنس سے کوئی عبادت مقصودہ فرض یا واجب ہو)۔“

نماز باجماعت کی صف بندی میں بچوں کا مقام

سوال:

آپ کے اس مفید اور علمی صفحے کے ذریعے میں آپ کی توجہ دو اہم مسائل کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ پہلا یہ کہ آج کل کی بزرگ نسل کو اپنی نئی نسل یا پود سے یوں تو بہت ساری شکایات ہیں لیکن بڑی شکایت یہ ہے کہ نئی نسل اپنے دین سے بیگانہ ہے اور مساجد ویران رہتی ہیں لیکن ہم نے کبھی ان کی وجوہات جاننے کی کوشش نہیں کی ہے۔ اس سلسلے میں ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی ہے وہ یہ کہ ہم بڑوں کا رویہ اس معاملے میں ٹھیک نہیں ہے۔ خاص طور پر جمعے کے دن بچے سب سے پہلے نہادھو کر تیار ہو کر مسجد میں آ جاتے ہیں بڑے لوگ عام طور پر وقت کے وقت پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جماعت کھڑی ہونے کے وقت امام صاحب خاص طور پر یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ تمام بچے پچھلی صف میں چلے جائیں تو عام طور پر ہمارے جیسے چھوٹے علاقے کی چھوٹی مسجد کی آخری صف دراصل مسجد کے باہر ہوتی ہے، اس اعلان پر لوگ فوری طور پر عمل کرتے ہیں اور گرمی ہو یا سردی بچوں کو اگلی صفوں سے نکال کر پیچھے کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ بچے جو بڑی خوشی خوشی نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں ان کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ عام نمازوں میں بھی یہ ہوتا ہے کہ بچے جو کہ بڑے نمازیوں کی صف چھوڑ کر ان سے پچھلی صف میں کھڑے ہوتے ہیں بعد میں آنے والے بڑے ان کو نیت بندھی حالت میں کھسکاتے ہوئے پیچھے پہنچا دیتے ہیں جس سے میرے خیال میں ان کے دل و دماغ پر مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے بارے میں کوئی زیادہ اچھا اثر نہیں پڑتا۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ بڑے نمازی وقت سے پہلے خاص طور پر جمعے کے دن پہنچنے کی کوشش کریں اور جب جماعت کھڑی ہو تو چھوٹے بچوں کو صفوں کے دائیں بائیں کھڑا کیا جائے نہ کہ سب سے پیچھے یا مسجد سے باہر۔ آپ مجھے اور دوسرے قارئین کو یہ بتلائیے کہ ہمارا مذہب ہمارا دین جو کہ آسانیاں پہنچانے والا اور انتہا پسندی سے روکنے والا مذہب ہے وہ اس بارے میں کیا کہتا ہے۔

﴿ایس۔ این اقبال، سرجانی ٹاؤن۔ کراچی﴾

جواب :

عام کتب فقہ میں نماز کی صفوں کی ترتیب اس طرح درج ہے:

و یصف الرجال ثم الصبيان ثم النساء لقوله عليه السلام لیلینی منکم اولوالاحلام والنهی۔

﴿ہدایۃ اولین : ص ۱۰۳﴾

”اور پہلے مردوں کی صفیں ہوں۔ پھر بچوں کی اور پھر عورتوں کی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: (جماعت میں) میرے قریب بالغ اور عقلمند ہونے چاہئیں۔“
در مختار میں ہے:

(الرجال) ظاہرہ یعم العیید (تم الصبیان) ظاہرہ، فلو واحد دخل الصف۔

” (نماز کی صفوں کی ترتیب میں پہلے) مرد ہوں گے، بظاہر یہ غلاموں کو بھی شامل ہے، پھر بچے، بظاہر یہ اس صورت میں ہے کہ ان کی تعداد زیادہ ہو، اور اگر ایک ہی بچہ ہو تو (مردوں کی) صف میں شامل ہو جائے گا۔“
اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

”البحر الرائق میں اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: اور اسی طرح اگر مقتدی صرف ایک مرد اور ایک بچہ ہوں تو وہ دونوں امام کے پیچھے اکٹھے صف بنا کے کھڑے ہوں گے، کیونکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اور یتیم نے آپ کے پیچھے صف بنائی اور بڑھیا ہمارے پیچھے تھیں، اور ایک بچے کا مسئلہ ایک عورت کے مسئلے سے مختلف ہے، کیونکہ عورتیں ایک ہوں یا زیادہ حدیث مذکور کی بناء پر بہر صورت پیچھے الگ صف میں کھڑی ہوں گی۔“

﴿ردالمحتار جلد نمبر ۲ صفحہ ۲۷۰-۲۶۹۔ دار احیاء التراث العربی بیروت﴾

حدیث پاک کی روشنی میں پہلی صف میں امام کے پیچھے وسط صف میں ایسے عاقل و بالغ اور متشرع افراد ہونے چاہئیں جو کسی ہنگامی صورت میں امام کی نیابت کر سکیں۔ باقی ترجیحی ترتیب تو یہی ہے کہ پہلے مردوں کی صفیں ہوں اور پھر بچوں کی، لیکن مذکورہ بالا فقہی عبارت سے ظاہر ہے کہ بوقت ضرورت جب کہ اگلی صفیں نامکمل ہوں تو بچے بڑوں کے ساتھ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اگر اگلی صفیں نامکمل تھیں اور بچے درمیان میں آ کر شامل ہو گئے تو بعد میں انہیں نکال کر پیچھے بھیجنا مروت کے خلاف ہے۔

آج کل عام طور پر مشاہدے میں آیا ہے کہ بچوں کو بالکل الگ تھلگ کر کے آخری صف میں کھڑا کر دیا جائے تو وہ دوران نماز شرارتیں کرتے ہیں اور اس طرح سارے نمازیوں کی یکسوئی اور حضور قلبی میں خلل واقع ہوتا ہے، اگر انہیں بڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے تو زیادہ باادب ہو کر پڑھتے ہیں اور بڑوں سے سیکھتے بھی ہیں۔ اور جب بچے نیت باندھ کر آگے کی صف میں کھڑے ہو جائیں تو انہیں

گھسیٹ کر پیچھے کرنا آداب نماز کے منافی ہے اور اگر اس کا سینہ قبلے سے پھر گیا یا وہ چل کر پیچھے آیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ لیکن یہاں ایسے بچے مراد ہیں جو باشعور ہوں، نماز اور مسجد کے آداب کو سمجھتے ہوں۔

بعض لوگ ایسے کم عمر اور ناشیخہ شرارتی بچوں کو اپنے ساتھ مسجد میں لے آتے ہیں، جو مسجد میں ادھر ادھر دوڑتے ہیں، نمازیوں کے آگے سے بے دھڑک گزرتے ہیں، شور مچاتے ہیں، کبھی جماعت کے دوران رونے لگ جاتے ہیں، کبھی پیشاب بھی کر لیتے ہیں اور آج کل مساجد میں بالعموم قالینیں بچھی ہوتی ہیں، جن کو پاک کرنا کافی دشوار ہوتا ہے، تو ایسے بچوں کو مسجد میں لانا ہی شرعاً منع ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

جنبوا مساجدکم صبیانکم و مجانینکم و بیعکم و شرآءکم و رفع اصواتکم و سلّ سیوفکم و اقامة حدودکم و جمر و هافى الجمع واجعلوا على ابوابها المطاهرة۔ ﴿ابن ماجہ رقم الحدیث..... ۷۵۰/۳﴾

”اپنی مسجدوں کو (ناشیخہ) بچوں، پاگلوں، لین دین کے معاملات، شعور و شغب، لڑائی جھگڑے اور (مساجد کے اندر) حدود شرعی کے قیام سے بچا کر رکھو، اور جمعہ کے دن انہیں کسی خوشبودار چیز کی دھونی دو اور ان کے دروازوں پر (پانی کے) ایسے برتن رکھ دیا کرو (جن کے ذریعے صفائی کی جاسکے۔“
در مختار میں ہے:

ویحرم ادخال صبیان و مجانین حیث غلب تنجیسہم، والا فیکرہ۔

﴿فتاویٰ شامی ج ۲ ص ۳۷۱، دار احیاء التراث العربی﴾

”اور بچوں اور فاجر عقل لوگوں کا مسجد میں داخل کرنا حرام ہے کیونکہ اکثر وہ ناپاک ہوتے ہیں، اور اگر ناپاک نہ ہوں تو مکروہ تنزیہی ہے۔“

یہاں حرام سے مراد مکروہ تحریمی ہے۔ ہمیں بچوں کے معاملے میں افراط و تفریط سے بچنا چاہئے، ناشیخہ اور شعورِ آداب مسجد سے عاری کم عمر بچوں کو مسجد میں لے کر نہیں آنا چاہئے اور باشعور و باادب بچوں کی حوصلہ شکنی بھی نہیں کرنی چاہئے، اگر وہ صفوں کے درمیان پہلے سے موجود ہیں تو انہیں گھسیٹ کر پیچھے نہیں کرنا چاہئے، یہ مروت اور بزرگانہ شفقت کے خلاف ہے، وہ بڑوں کے درمیان کھڑے ہوں گے تو باادب رہیں گے اور بڑوں سے سیکھیں گے۔

صلوٰۃ قصر کا مسئلہ

سوال :

کیا فرماتے ہیں علماء دین اس بارے میں کہ:

ہم لوگ کراچی کے مستقل رہائش پذیر ہیں۔ روزگار کے سلسلے میں تقریباً ۱۰۰ میل کی مسافت پر دیوان فاروق موٹرز کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں۔ ہماری چھٹی کا سیٹ اپ کچھ اس طرح ہے کہ ہم پیر کی صبح کراچی سے آتے ہیں اور ہفتہ کی دوپہر واپس کراچی آ جاتے ہیں۔ کراچی میں ہمارا قیام تقریباً ایک روز کا ہوتا ہے، باقی چھ دن ہم مستقل طور پر دیوان سٹی میں ہی رہتے ہیں۔ مزید یہ کہ ہم دیوان موٹرز کمپنی میں مستقل ملازم ہیں۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال سے جاری ہے۔ آپ سے معلوم یہ کرنا ہے کہ ہم پر نماز قصر فرض ہے یا پوری نماز فرض ہے؟

دوسرا یہ کہ ہم کراچی میں قصر ادا کریں یا دیوان سٹی میں یا دونوں جگہ مکمل نماز ادا کریں؟

اکثر علماء سے ہم نے یہ مسئلہ معلوم کیا ہے، کچھ کی رائے میں ہم مسافر ہیں کچھ کی رائے میں مقیم۔ واضح کیا جائے کہ ہم مسافر ہیں یا مقیم؟

ملازمت مستقل ہے اور کمپنی کی طرف سے اتوار کی چھٹی ہوتی ہے، ہم لوگ گھر چلے آتے ہیں پھر پیر کو واپس چلے جاتے ہیں اور کبھی کبھی اتوار کو بھی کام کے لئے روک لیتے ہیں؟

﴿سائل: محمد شاہد اعوان ہزاروی اینڈ دیوان سٹی ورکرز، سجاول۔ ضلع ٹھٹھہ﴾

جواب :

کراچی تو آپ لوگوں کا وطن اصلی ہے، لہذا آپ جب بھی کراچی میں ہوں گے، پوری نماز پڑھیں گے، خواہ کراچی میں آپ کا قیام کم وقت کے لئے ہو یا زیادہ وقت کے لئے۔ باقی دیوان سٹی (یعنی دیوان فاروق موٹرز کمپنی) کراچی سے سو میل کی مسافت پر ہے، اور کم از کم مسافت سفر، جس پر نماز میں قصر کرنا واجب ہے، ۶۱ میل ۲ فرلانگ ۲۰ گز یا ۹۸.۷ کلومیٹر ہے، لہذا دیوان سٹی کے لئے جب آپ سفر کریں گے تو قصر پڑھیں گے، اور جب تک کسی مقام پر بندہ پندرہ دن یا اس سے زیادہ عرصے کے لئے قیام کی نیت نہ کرے، شرعاً مسافر ہی رہے گا، مقیم نہیں ہوگا۔ چونکہ آپ لوگ ہفتے میں چھ دن دیوان سٹی میں قیام کرتے ہیں، لہذا اس عرصے میں آپ مسافر ہی رہتے ہیں اور آپ کو نماز قصر ہی پڑھنی ہوگی، کبھی کبھی مکان کی طرف سے اتوار کو روکے جانے سے سفر کا شرعی حکم تبدیل نہیں ہوگا۔

احمد رضا قادری رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں:

”نوکری ملازمت ہے اس میں قصد استدامت ہوتا ہے تو جو جہاں نوکر ہو کر رہنا اختیار کرے مقیم ہو جائے گا۔ اگرچہ بالخصوص

پندرہ دن کی نیت نہ ہو لان نية الاستدامة فوق ذلك (کیونکہ استدامت نیت سے فوقیت رکھتی ہے)

ہاں اگر مدت سفر سے یہاں نوکر ہو کر آیا اور معلوم ہے کہ پندرہ دن ٹھہرنا ہوگا تو البتہ مقیم نہ ہوگا، جب اس دوسری جگہ سے فارغ ہو کر آئے گا اور یہاں ملازمانہ قیام کرے گا اس وقت سے مقیم ہوگا۔

كما قال في رد المحتار في واقعة عيسى بن ابان رحمه الله تعالى ان نية الاقامة لم تعمل عملها الا بعد رجوعه لوجود خمسة عشر يوما بلانية خروج في اثائها بخلاف ما قبل خروجه الى عرفات لانه لما كان عازما على الخروج قبل تمام نصف شهر لا يصير مقيما۔

جیسا کہ رد المحتار میں شیخ عیسیٰ بن ابان رحمہ اللہ تعالیٰ کے واقعہ میں ہے کہ نیت اقامت مؤثر نہیں مگر رجوع کے بعد، کیونکہ پندرہ دنوں کی نیت ہے اور اس میں نکلنے کی نیت بھی نہیں بخلاف عرفات کی طرف نکلنے سے پہلے کے کیونکہ جب نصف ماہ کے اتمام سے پہلے نکلنے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ مقیم نہیں ہوگا۔

اور جبکہ ایک جگہ نوکر ہو کر رہے اور پندرہ دن کے اندر وہاں سے دوسری جگہ جانا معلوم نہ ہو تو صرف احتمال قاطع اقامت نہ ہوگا ورنہ کوئی وطن اقامت نہ ہو سکے اور اپنے وطن سے مدت سفر پر جو لاکھوں آدمی نوکر ہوتے اور برسوں وہاں رہتے ہیں کبھی مقیم نہ ہوں کہ بدلی یا کسی کام پر بھیجے جانے کا احتمال ہر وقت ہے۔ ﴿فتاویٰ رضویہ، ج ۸ ص ۲۶۵-۲۶۳ رضافاؤنڈیشن۔ لاہور﴾

امام احمد قادری نے لکھا کہ ”نوکر کی ملازمت ہے، اس میں قصد استدامت (لمبے عرصے کیلئے ٹھہرنا) ہوتا ہے، تو جہاں نوکر ہو کر رہنا اختیار کرے، مقیم ہو جائے گا، اگرچہ بالخصوص پندرہ دن کی نیت نہ ہو، کیونکہ کسی جگہ لمبے عرصے تک رہنے کی نیت بالخصوص پندرہ دن قیام کی نیت سے فوقیت رکھتی ہے۔“ اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی کسی مقام پر ملازم ہو کر ٹھہر جاتا ہے تو بظاہر اس کا لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے کی نیت محض پندرہ دن قیام کی نیت سے زیادہ مؤثر ہے۔

لیکن سائل کے استفتاء میں صورت حال مختلف ہے، انہیں پہلے ہی سے معلوم ہے کہ اختتام ہفتہ وہ کراچی واپس آ جائیں گے، یہاں ابتداء ہی استدامت (لمبے عرصے کے لئے ٹھہرنے) کی نیت نہیں ہے، لہذا یہ لوگ شروع ہی سے مسافر ہیں اور قصر پڑھیں گے، ان کے بقول صرف یہ احتمال ہے کہ کبھی مالکان اتوار کے لئے بھی کام پر روک لیتے ہیں، تو امام احمد رضا قادری نے لکھا کہ: ”اور جب کہ ایک جگہ نوکر ہو کر رہے اور پندرہ دن کے اندر وہاں سے دوسری جگہ جانا معلوم نہ ہو، صرف احتمال قاطع اقامت نہ ہوگا۔“ یعنی جب کسی جگہ ملازمت اختیار کر لی ہے اور بظاہر لمبے عرصے رہنے کا ارادہ ہے تو صرف اس احتمال سے حکم اقامت ختم نہیں ہوگا کہ پندرہ دن کے اندر وہاں سے جا بھی سکتے ہیں۔ اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جب پہلے سے معلوم ہے کہ اختتام ہفتہ کراچی جانا ہے تو شروع ہی سے مسافر ہے اور قصر پڑھے گا، اور محض یہ احتمال کہ کارخانے کے مالکان اتوار کو روک بھی لیتے ہیں، اس سے حکم سفر و قصر اور عدم اقامت ختم نہیں ہوگا اور یہ لوگ ”دیوان سٹی“ میں قصر ہی پڑھیں گے۔

سنتوں کی قضا

سوال:

اگر عذریا کوتاہی کی بناء پر کسی وقت کی نماز رہ جائے تو اس وقت کی قضا پڑھتے وقت سنتوں کی قضا بھی پڑھی جائے گی یا نہیں، اور اگر کسی کی فجر کی نماز قضا ہو جائے تو صرف فرض کی قضا پڑھے یا سنتوں کی بھی۔ ﴿فیصل ندیم احمد قادری، شاہ فیصل کالونی﴾

جواب:

سنتوں کی قضا لازم نہیں ہے، اگر خدا نخواستہ مثلاً کسی شخص کی ظہر یا عصر یا مغرب کی نماز رہ گئی ہے تو وہ اب صرف فرض کی قضا کرے گا، سنتوں کی نہیں۔ تاہم فجر کی دو سنتیں باقی اوقات کی سنتوں کے مقابلے میں زیادہ مؤکد ہیں، اس لئے بعض نے انہیں واجب کے قریب قرار دیا ہے۔ لہذا اگر کسی کی فجر کی نماز رہ گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسی دن زوال سے پہلے قضا پڑھ لیتا ہے تو فرض اور سنت فجر دونوں کی قضا کرے، لیکن اگر تنگی وقت یا جماعت چلے جانے کے خوف سے فرض پڑھ لئے تھے اور سنتیں رہ گئی تھیں تو اب صرف سنتوں کی قضا نہیں کرے گا۔

درمختار میں ہے:

(وتقضى) اذافات معہ، بخلاف البواقی۔

”اور فجر کی سنتوں کی قضا پڑھی جائے گی جبکہ فرضوں کے ساتھ فوت ہو جائیں، بخلاف باقی سنتوں کے (کہ ان کی قضا لازم نہیں ہے)“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

(وتقضى) ای الی قبیل الزوال، قوله ”معہ“ تنازعه ”تقضى وفات“ فلا تقضى الامعه حیث فات وقتها، واما اذا

فاتت وحدها فلا تقضى، ولا تقضى قبل الطلوع ولا بعد الزوال ولوتبعاً علی الصحيح۔

”یعنی اگر فجر کی قضا زوال سے پہلے پہلے پڑھی جائے تو سنتوں کی قضا بھی پڑھی جائے گی، ”تقضى“ اور ”فات“ دونوں افعال کا ”معہ“ کے ساتھ تعلق ہے، یعنی فجر کی سنتوں کی قضا نہیں ہے مگر جبکہ (اُسی دن زوال سے پہلے) فرضوں کے ساتھ پڑھے جائیں تو قضا ہے، کیونکہ ان کا وقت فوت ہو چکا ہے، لیکن اگر تنگی وقت یا جماعت کے چھوٹ جانے کے خوف سے فجر کے فرض پڑھ لئے گئے ہوں (اور) صرف سنتیں رہ گئی ہوں تو ان کی قضا نہیں ہے، نہ طلوع سے پہلے اور نہ ہی زوال کے بعد، تو صحیح قول کے مطابق (زوال کے بعد) فرضوں کی متابعت میں بھی سنتوں کی قضا نہیں ہے۔“ ﴿ردالمحتار ج ۲۔ ص ۳۹۵ دار احیاء التراث العربی﴾

مرضِ ریح میں نماز کی ادائیگی

سوال:

رتح خارج ہونے کے سبب اگر وضو زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے تو نماز کیسے پڑھیں؟ ﴿لَتَقِ، جیکب لائن۔ کراچی﴾

جواب:

اگر یہ شکایت کبھی کبھار پیدا ہو تو ہر بار تازہ وضو کر کے نماز پڑھیں، نماز کے دوران ہو جائے تو فوراً نماز چھوڑ کر چلے جائیں اور تازہ وضو کر کے اسی پر بنا کر کے نماز مکمل کر لیں یا از سر نو پڑھ لیں۔ لیکن غلبہٴ ریح یا کثرتِ ریح کا عارضہ اتنا شدید ہو کہ ایک وقت کی نماز پڑھنا بھی دشوار ہو جائے اور ایسا مسلسل یا بار بار ہوتا ہو تو یہ ایک بیماری ہے اور ایسا شخص شرعاً معذور ہے۔ اسے چاہئے کہ ایک فرض نماز کے وقت کے لئے تازہ وضو کر لے اور اس وضو سے اس وقت کے اندر جتنی فرض یا نفل نمازیں چاہے پڑھ سکتا ہے اور تلاوت بھی کر سکتا ہے، خواہ رتح خارج ہوتی رہے، بس نئے وقت کی نماز کے لئے تازہ وضو کرنا پڑے گا، یہی حکم اس کا ہے جسے مسلسل پیشاب کے قطرے آتے ہوں یا زخم سے خون یا پیپ رستی ہو۔

قرآن کی تلاوت کے دوران ’ن‘ آجائے تو کس طرح پڑھیں

سوال:

قرآن مجید کی تلاوت کے دوران بعض جگہ چھوٹا سا ’ن‘ لکھا ہوتا ہے، اسے کس طرح پڑھا جائے، جیسے سورہ ”ہُمَزہ“ میں ”وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ اَلَّذِي“ ﴿مسز سرور منظر۔ ڈیفنس فیئر II﴾

جواب:

اگر ”ہُمَزہ“، پر وقف کریں تو ”اَلَّذِي“ پڑھیں گے، اور اگر ملا کر پڑھیں وقف نہ کریں تو ”ن“ پڑھیں گے، یعنی ”لُّمَزَةٍ اَلَّذِي“۔

عورتوں کی جماعت

سوال:

اگر عورتیں مل کر جماعت کا اہتمام کریں اور ایک عورت ان کی امامت کرے، تو کیا اس طرح خواتین کا باجماعت تراویح پڑھنا جائز ہے؟ ﴿نسیم ناصر، گلشن اقبال۔ عبدالرؤف، کلفٹن۔ سلطانہ بیگم، کلفٹن۔ محمد طیب، ناظم آباد﴾

جواب:

مردوں کے لئے عورت کا امام بننا بالاجماع باطل ہے۔ عورت کا عورتوں کی امامت کرنے کے بارے میں یہ ہے کہ امام مالک کے نزدیک جائز نہیں ہے، امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کے نزدیک جائز ہے، فقہ حنفی میں مکروہ تحریمی ہے۔ بعض احادیث مبارکہ میں عورت کی امامت کا تذکرہ ملتا ہے۔ سنن ابی داؤد۔ سنن کبریٰ بیہقی اور المستدرک للحاکم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام ورقہ انصاریہ رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر پر امامت کی اجازت دی تھی اور ان کے لئے ایک بوڑھے شخص کو مؤذن مقرر کیا تھا۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ چلو شہیدہ کے پاس جائیں اور ان کی زیارت کریں۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ بشارت پوری ہوئی اور عہد خلافت فاروقی میں ان کے مدبر (جسے مالک یہ کہہ دے کہ تو میری موت کے بعد آزاد ہے) غلام اور باندی نے انہیں شہید کر دیا۔ فقہاء احناف میں سے علامہ کمال الدین ابن ہمام نے فتح القدیر میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ احادیث کی توجیہ بھی کی ہے۔

ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کے لئے عورت کی امامت زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی ہے۔ تاہم اگر کہیں ایسا ہو کہ عورتیں عورت کو امام بنالیں تو امام بننے والی خاتون صف کے درمیان میں کھڑی ہو۔

سجدہ تلاوت بھول جائیں تو؟

سوال:

سجدہ تلاوت بھول جائیں تو کس طرح اور کب ادا کیا جائے۔ ﴿فیروز سلطانہ۔ ناظم آباد﴾

جواب:

اگر نماز کے اندر بھول گئے ہیں اور بروقت ادا نہیں کیا تو نماز کے اندر یاد آنے پر ادا کر دیں اور سجدہ سہو بھی کریں، اگر نماز کے اندر یاد نہیں آیا اور نماز سے فارغ ہو گئے تو نماز ادا ہو گئی اور نماز کے اندر بھولے ہوئے سجدہ سہو کی قضا خارج نماز نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے

معافی مانگیں۔ اگر خارج نماز تلاوت کے دوران آیت آگئی اور بروقت سجدہ ادا نہیں کیا تو بعد میں یاد آنے پر ادا کر لیں، مکروہ اوقات کے علاوہ۔

ایک جگہ پنج وقتہ نماز ادا کی جا رہی تھی، اب قریب مسجد بن گئی تو؟

سوال:

ایک جگہ پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کی جاتی رہی ہے، قریب مستقل مسجد بن گئی ہے، تو اب سابقہ جگہ کا کیا حکم ہے؟

﴿محمد حسن۔ لیما رکیٹ﴾

جواب:

اگر وہ باقاعدہ مسجد نہیں بنائی گئی تھی بلکہ محض جائے نماز کے طور پر استعمال کی جا رہی تھی تو مسجد میں منتقل ہونے کے بعد یہ جگہ کسی بھی مقصد کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، اور اگر بانی نے اسے باقاعدہ مسجد بنایا تھا اور اسے اس جگہ پر مالکانہ تصرف کا حق حاصل تھا، تو اب وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، اس کی حیثیت تبدیل نہیں کی جاسکتی، بشرطیکہ جائز طور پر اسے مسجد کیلئے وقف کیا گیا ہو۔

نماز میں قصر، وطن اصلی اور وطن اقامت کے مسائل

سوال:

میں اپنے شوہر کے ساتھ ایبٹ آباد میں مقیم ہوں اور ہم دونوں ڈاکٹر ہیں اور گورنمنٹ سروس میں ہیں، میرے شوہر کے والدین لاہور کی ایک مضافاتی بستی میں مقیم ہیں اور میرے شوہر کی ولادت اور انٹر تک تعلیم بھی وہیں پر ہوئی ہے، اب ہم دونوں میاں بیوی نے ایبٹ آباد کو اپنی فکری اور عملی طور پر مستقل وطن کے طور پر اختیار کر لیا ہے، لیکن ابھی تک ہمارا وہاں پر کوئی مکان یا غیر منقولہ جائیداد یعنی پلاٹ وغیرہ نہیں ہے، ہم اپنے بچوں کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب عطا ہوں گے تو اپنا مکان بھی بنالیں گے، تاہم، ہم دونوں میاں بیوی نے لاہور کو اپنا وطن اصلی ہونے کے تصور کو ترک کر دیا ہے، بلکہ یہ کوشش ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسباب مہیا ہونے اور حالات سازگار ہونے پر میرے سسرال والے سب کے سب مانسہرہ ہزارہ منتقل ہو جائیں گے۔ میرے والدین پشاور میں مستقل طور پر مقیم ہیں، والد صاحب کا مقام پیدائش اور آبائی گھر، والدہ صاحبہ (یعنی میری دادی) وغیرہ مانسہرہ کے ایک گاؤں میں مقیم ہیں، کبھی میں چھٹی پر والدین کے ہاں پشاور چلی جاتی ہوں، کبھی والد صاحب کے آبائی گاؤں جاتی ہوں اور کبھی ہم سسرال سے ملنے لاہور چلے جاتے ہیں، اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں فقہی احکام اور نماز قصر کے اعتبار سے

ایبٹ آباد ہمارا ”وطن اصلی“ قرار پائے گا یا ”وطن اقامت“؟۔ ہم کبھی مختصر قیام کے لئے اپنے شوہر کے والدین کے ہاں لاہور جائیں جو کہ میرے شوہر کی جائے پیدائش اور بدستور آبائی گھر ہے، یا ہم میرے آبائی گھر پشاور جائیں، جو کہ میرے شوہر کا سرالی گھر بھی ہے، یا کبھی ہم مانسہرہ میں میرے والد صاحب کے آبائی گھر جائیں تو ہمارے لئے یہ تینوں مقامات ”وطن اصلی“ کے حکم میں ہوں گے اور ہم ان مقامات پر مدت قیام سے قطع نظر پوری نماز پڑھیں گے یا اب یہ ”وطن اصلی“ نہیں رہے اور پندرہ دن سے کم قیام کی صورت میں قصر نماز پڑھیں گے۔ اور کیا ایبٹ آباد ہمارا وطن اصلی ہے یا وطن اقامت؟۔ بعض علماء کرام سے سنا ہے کہ مقام پیدائش یا جہاں والدین مستقل طور پر سکونت پذیر ہوں، ہمیشہ ”وطن اصلی“ ہی کے حکم میں رہتے ہیں، اسی طرح جب کوئی شخص سرال میں جائے گا، تو اس کا حکم ”وطن اصلی“ کا ہے اور وہاں وہ پوری نماز پڑھے گا، اور جہاں ملازمت کی غرض سے مقیم ہے، وہ ”وطن اقامت“ قرار پائے گا اور قصر یا پوری نماز پڑھنے کے لئے مدت قیام کا اعتبار ہوگا۔ ﴿ڈاکٹر روبینہ شاہین۔ ایبٹ آباد﴾

جواب :

آپ کا سوال یقیناً کافی پیچیدہ ہے، میرے خیال میں ”وطن اصلی“ اور ”وطن اقامت“ کی فقہی تعریفات کے اطلاق میں بعض حضرات کو مغالطہ ہو جاتا ہے، اس لئے سب سے پہلے میں نماز قصر کے مسئلے پر ”اوطان“ (یعنی وطن اصلی و اقامت) کی فقہی تعریفات مستند ”کتب فتاویٰ“ سے نقل کروں گا اور آخر میں آپ کے سوالات کے جوابات عرض کروں گا۔ علامہ علاء الدین حصکفی درمختار میں لکھتے ہیں:

(الوطن الاصلی) هو موطن ولادته او تاهله او توطنه۔

”کسی شخص کا وطن اصلی اس کی جائے ولادت ہے یا جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے یا جسے وہ اپنے وطن کے طور پر اختیار کر لے۔“

اس کی شرح میں علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

قوله: (الوطن الاصلی) ویسمی بالاهلی و وطن الفطرة ح عن القهستانی، قوله: (او تاهله) ای تزوجه۔

”وطن اصلی“ کو ”وطن اصلی“، ”وطن اہلی“ اور ”وطن الفطرة“ بھی کہا جاتا ہے، اور تاهل کے معنی ہیں: شادی کرنا۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں: ”شرح المنیہ“ میں ہے: اور اگر کسی شخص نے کسی شہر میں شادی کر لی اور اس نے وہاں اقامت کی نیت نہیں کی، تو ایک قول یہ ہے کہ وہ مقیم نہیں بنے گا اور ایک قول یہ ہے کہ مقیم بن جائے گا، اور یہ قول زیادہ مناسب ہے، اور اگر اس کی دو شہروں میں دو بیویاں ہوں، تو وہ ان میں سے جس شہر میں بھی داخل ہو، (داخل ہوتے ہی) مقیم ہو جائے گا، اور اگر کسی ایک مقام پر اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا ہے تو اب وہ اس کا وطن اصلی نہیں رہے گا، خواہ وہاں پر اس کے مکانات اور غیر منقولہ جائیداد بھی ہو، کیونکہ اعتبار مکان کا نہیں

بیوی بچوں کا ہے، جیسے اگر وہ کسی مقام پر شادی کر کے رہنے لگتا ہے، حالانکہ وہاں اس کا مکان وغیرہ نہیں ہے، تو بھی وہ اس کا وطن اصلی ہی کہلائے گا، ایک قول یہ ہے کہ بیوی کی وفات کے بعد بھی وہاں اس کا وطن اصلی ہی رہے گا، اور توطن (یعنی کسی مقام کو بطور وطن اختیار کرنے) کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص وہاں مستقل قیام کا ارادہ کر لے اور وہاں سے اس کا کہیں اور منتقل ہونے کا ارادہ نہ ہو، اگرچہ وہاں اس نے شادی نہ کی ہو۔ اگر کسی ایسے مقام پر اس کے والدین مقیم ہیں جو اس کی جائے ولادت نہیں ہے اور وہ بالغ ہے (یعنی اب حکماً ماں باپ کے تابع نہیں ہے) اور اس نے وہاں شادی بھی نہیں کی، تو وہ اس کا وطن نہیں ہے، سوائے اس کے کہ وہاں وہ مستقل رہنے کا پختہ ارادہ کر لے اور اپنے پہلے وطن اصلی کو خیر باد کہہ دے، یہ مسئلہ ”شرح المنیہ“ سے ماخوذ ہے۔

﴿رد المحتار، ج ۲، ص ۵۳۶، ۵۳۵، طبع جدید﴾

فتاویٰ عالمگیری ج ۱ ص ۴۳ پر ہے:

عبارة عامة المشائخ ان الاوطان ثلاثة، وطن اصلی وهو مولد الرجل او البلد الذی تأهل به و وطن سفر و قدسمى وطن اقامة و هو البلد الذی ينوی المسافر الاقامة فيه خمسة عشر يوما او اكثر و وطن سكنی وهو البلد الذی ينوی الاقامة فيه دون خمسة عشر يوما، و عبارة عامة المحققين من مشائخنا ان الوطن و طنان، وطن اصلی و وطن اقامة ولم يعتبروا وطن السكنی و طنا وهو الصحيح هكذا في الكفاية۔

عام علماء کی عبارت یہ ہے کہ وطن تین قسم کے ہیں، ایک وطن اصلی اور یہ اس کی جائے پیدائش یا وہ مقام ہے جہاں وہ شادی کر کے اپنے اہل کے ساتھ رہے، اور دوسرا وطن سفر اور اسے وطن اقامت بھی کہا جاتا ہے، یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن یا اس سے زیادہ مدت کے لئے رہنے کا ارادہ رکھتا ہے، اور تیسرا وطن سکنی ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی مسافر پندرہ دن سے کم مدت کے لئے ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے، اور ہمارے علماء میں سے عام محققین کا کہنا یہ ہے کہ وطن کی دو ہی قسمیں ہیں، وطن اصلی اور وطن اقامت، اور وہ ”وطن سکنی“ کا اعتبار نہیں کرتے اور یہی قول صحیح ہے، اور کفایہ میں بھی اسی طرح ہے۔

علامہ زین الدین ابن نجیم البحر الرائق ج ۲ ص ۱۳۶ پر لکھتے ہیں:

”والوطن الاصلی هو وطن الانسان فی بلدته او بلدة اخرى اتخذها دارا او توطن بها مع اهله و ولده و ليس من قصده

الارتحال عنها بل التعیش بها“

”اور وطن اصلی، وہ انسان کا وہ وطن ہے، جسے اس نے اپنا گھر بنا لیا ہو یا وہ وہاں پر اپنے بیوی، بچوں کے ساتھ رہ رہا ہو اور اس کا وہاں سے منتقل ہونے کا ارادہ نہ ہو بلکہ (مستقل طور پر) وہاں رہنے کا ارادہ ہو۔“

آگے چل کر لکھتے ہیں: وطن اصلی اپنی مثل (یعنی وطن اصلی) سے ہی باطل ہوتا ہے، نہ کہ کسی اور سے، اس کی صورت یہ ہوگی کہ وہ کسی مقام کو بطور وطن (اصلی) اختیار کر لے اور اس کے بیوی بچے وہاں منتقل ہو جائیں، تو اب پہلا وطن، وطن اصلی نہیں رہے گا، یہاں تک کہ اگر پھر کبھی وہاں جائے تو مسافر کی حیثیت سے نماز پڑھے گا، یہ جو ہم نے پہلے وطن اصلی سے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل ہونے کی قید لگائی ہے، اس لئے کہ اگر اس سے بیوی بچوں کے ساتھ منتقل نہیں ہوا، لیکن اس نے کسی اور مقام پر بھی شادی کر کے وہاں اپنے اہل کے ساتھ قیام اختیار کر لیا ہے، تو اس صورت میں پہلا اور دوسرا دونوں کا حکم وطن اصلی کا ہی ہوگا اور دونوں مقام پر پوری نماز پڑھے گا، آگے چل کر لکھتے ہیں: ”محیط میں کہا اگر کسی شخص کی ایک بیوی بصرہ میں ہیں اور دوسری کوفہ میں، اور بصرہ میں بیوی کا انتقال ہو گیا، حالانکہ ابھی وہاں اس کا مکان زمین وغیرہ باقی ہے، تو ایک قول یہ ہے کہ اب بصرہ وطن اصلی نہیں رہے گا، کیونکہ وہ وہاں اپنے بیوی بچوں کے سبب وطن اصلی کے حکم میں تھا نہ کہ غیر منقولہ جائیداد کی وجہ سے، آپ غور تو کریں، اگر وہ کسی مقام پر بیوی بچوں کے ساتھ رہائش اختیار کرتا ہے، حالانکہ وہاں اس کی کوئی غیر منقولہ جائیداد نہیں ہے، تو وہ اس کا وطن اصلی بن جائے گا۔“

ان مستند ”کتب فقہ و فتاویٰ“ کے حوالہ جات اور تفصیلی عبارات نقل کرنے کے بعد جو مفہوم اور خلاصہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ ”وطن“ یعنی کسی مقام کو وطن اصلی کے طور پر اختیار کرنے کے لئے یہ لازمی شرط نہیں ہے کہ وہاں اس شخص کے زیر ملکیت مکان یا غیر منقولہ جائیداد ضرور ہو، کیونکہ ان چیزوں کا حصول مالی وسعت پر موقوف ہے، اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ وہ مقام اس کی جائے پیدائش ہو، بلکہ اپنی نیت، عمل اور ارادے سے کسی مقام پر مستقل طور پر قیام کرنے سے وہ مقام ”وطن اصلی“ بن جاتا ہے اور اسی کو ”کتب فقہ و فتاویٰ“ میں ”وطن“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ جائے ولادت کا ہمیشہ ”وطن اصلی“ رہنا ضروری نہیں ہے، خواہ والدین میں سے کوئی ایک یا دونوں وہاں پر مقیم ہوں، یا والدین کا انتقال ہو چکا ہو لیکن وہاں اس کی مملوکہ یا موروثی جائیداد وغیرہ منقولہ (یعنی زمین و مکانات) ہو۔ عاقل و بالغ ہونے کے بعد جب کسی نے اپنے مولد یا موروثی مقام کے علاوہ کسی دوسرے مقام کو مستقل وطن کے طور پر اختیار کر کے وہاں اقامت اختیار کر لی اور اپنی نیت اور ارادے میں اور عملاً بھی پہلے ”وطن اصلی“ کو ترک کر دیا تو اب یہ دوسرا وطن ہی وطن اصلی ہے، پہلا وطن، وطن اصلی نہیں رہا، ”البحر الرائق“ کی عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مکمل و مدلل (جلد چہارم) میں سوالات نمبر ۲۱۹۸ اور ۲۱۹۹ کے جوابات میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔ اسی طرح ”نہاہل“ کے معنی محض شادی کرنے کے نہیں ہیں بلکہ اس مقام پر اہل و عیال کے ساتھ رہنے کے ہیں، لہذا اگر اس نے اپنے سرالی گھر یا مقام کو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش کے لئے اختیار کر لیا ہے تو وہ ”وطن اصلی“ کے حکم میں ہوگا اور وہ وہاں جب بھی جائے گا، خواہ ایک دن کے لئے سہی، پوری نماز پڑھے گا، لیکن جب کوئی شخص اپنے سرالی گھر یا مقام پر اپنے بچوں کے ساتھ مقیم نہیں ہے تو محض خسر کا گھر ہونا، وطن اصلی کے حکم میں نہیں ہے، فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل و مکمل (جلد چہارم) میں سوال

نمبر ۲۲۵۴ کے جواب میں یہی موقف اختیار کیا گیا ہے۔ تاہم اس مقام پر یہ لکھا ہے کہ اگر کسی مقام پر نماز کامل یا قصر پڑھنے میں اشتباہ ہو جائے تو احتیاطاً پوری پڑھ لے، جبکہ فتاویٰ شامی میں اس طرح کے اشتباہ کے موقع پر فرمایا ہے:

لانه اجتمع فی هذه الصلوة ما یوجب الاربع وما یمنع فرجحنا ما یوجب الاربع احتیاطاً۔

﴿فتاویٰ شامی، باب صلوة المسافر تحت قوله قاصداً، ج ۱، ص ۷۳۳﴾

”کیونکہ اس نماز میں ایسے دو اسباب یا دو صورتیں جمع ہو گئی ہیں جن میں سے ایک تکمیل نماز کو واجب کرتی ہے اور دوسری اس کیلئے مانع ہے، تو ہم نے احتیاطاً اس صورت کو ترجیح دی ہے جو (قصر کے بجائے) تکمیل نماز کو واجب کرتی ہے۔“

لہذا میری رائے میں چونکہ آپ لوگوں نے ایبٹ آباد کو وطن اصلی کے طور پر نیت و ارادے اور عمل سے اختیار کر لیا ہے، لہذا اب وہ آپ کا ”وطن اصلی“ ہے اور آپ وہاں ہر صورت میں پوری نماز پڑھیں گے۔ اور آپ کے شوہر نے اپنے آبائی مقام لاہور کی وطنیت کو مستقل طور پر ترک کر لیا ہے اور وہ اب عاقل و بالغ ہیں اور ماں باپ کے تابع نہیں ہیں، تو آپ کے والدین اور آپ کے شوہر کے خسر کا مستقل قیام تو ضرور ہے لیکن آپ کے شوہر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں مستقل طور پر مقیم نہیں ہیں، لہذا وہاں آپ لوگ پندرہ دن سے کم مدت اقامت کی صورت میں قصر پڑھیں گے۔ اسی طرح آپ کے والد کا آبائی مقام بھی آپ کا ”وطن اصلی“ نہیں رہا۔

میری گزارش ہے کہ اگر یہ سطور اہل فتویٰ علماء کی نظر سے گزریں اور وہ ان کا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو میرے اس موقف سے اتفاق یا اختلاف دونوں صورتوں میں اپنی آراء اور دلائل سے مطلع فرمائیں، غلطی پر آگاہ ہونے کی صورت میں میں اپنے موقف سے رجوع کرنے میں ادنیٰ تا مل بھی نہیں کروں گا، اللہ تعالیٰ مجھے حق کی حقانیت پر آگاہی نصیب فرمائے اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرمائے اور باطل کے بطلان پر آگاہی عطا فرمائے اور اس سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائے اور رائے اور فکر میں کجی سے محفوظ فرمائے۔

﴿کتاب الجنائز﴾

اپنے یا احباب کیلئے زندگی میں قبر تیار کرنا

سوال:

کیا کوئی شخص اپنے یا اپنے احباب کے لئے زندگی ہی میں قبر تیار کر سکتا ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت یا ممانعت تو نہیں ہے؟

﴿حنیف۔ کورنگی﴾

جواب :

جی ہاں زندگی میں قبر تیار کرنے میں کوئی شرعی ممانعت نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: ”جس نے اپنے لئے زندگی ہی میں قبر کھودی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اسے اس پر اجر ملے گا۔“

ممکن ہے اجر کی حکمت یہ ہو کہ اسے موت کی یاد آتی رہے گی۔ باقی اس کا اسی قبر میں دفن ہونا یا کرنا شرعاً ضروری نہیں ہے، اور قرآن مجید میں ہے:

وَمَا تَذَرِي نَفْسٌ اَبَايَ اَرْضٍ تَمُوتُ ط ﴿لقمان : ۳۴﴾

”کسی کو خبر نہیں کہ اس کی موت کس زمین پر آئے گی۔“

تدفین کے بعد میت کا قبر سے نکالنا**سوال :**

کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کن وجوہات کی وجہ سے آپ میت کو قبر سے نکال کے دوسرے قبرستان میں دفن کر سکتے ہیں۔ ہمارا واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عزیز ڈھائی مہینے پہلے لندن کے قبرستان میں دفنائے گئے اور ہم نے ان کو وہاں سے نکالنا ہے۔

(۱) مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی بھی دفن ہیں۔ ہمارے علم میں یہ نہیں تھا۔

(۲) قبرستان کے یہودی مالک وہاں پہ خصوصی دھیان نہیں دیتے اور وہ جگہ ویران لگتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہاں کا مالک یہودی ہے۔

(۳) ہماری گزارش کرنے کے باوجود یہودی مالک اپنے کتوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور نعوذ باللہ ہمارے عزیز کے قبر کی پاس ہم نے ان کی ناپاکی دیکھی تھی۔

(۴) ہم نے یہودیوں کے ساتھ کوئی بھی کاغذات پہ دستخط نہیں کیے اور وہ اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں لازمی قبر پکی کرنی ہے اور اگر ہم ایک مسلمان بھائی کی قبر کو پکی کرنے کا حکم دیتے ہیں تو یہودیوں کو اس بات کے بھی پیسے چاہئے۔

(۵) اگر کل کوئی ہمارے عزیز کے قبر کے پتھر کو توڑ دے تو وہ اس کی ذمہ داری نہیں اٹھائیں گے اور الٹا ہم سے پیسے مانگیں گے۔

(۶) تقریباً کوئی ایک سال پہلے اس قبرستان میں رات کے وقت وہاں کچھ لوگوں نے نعوذ باللہ قبروں کے پتھروں کو توڑ دیا تھا۔ کل رات بھی انہوں نے قبرستان کے گیٹ کو تالا نہیں لگایا۔

(۷) مرحوم کے چار چھوٹے بچے ہیں جو اپنے والد صاحب کے لیے قبرستان جا کر دعا مانگنے گئے۔ ان بچوں کے لیے وہ ماحول اور یہودی لوگ ٹھیک نہیں۔

(۸) ہم نے میت کو دفناتے وقت امانت نہیں کی تھی۔ ﴿محمد کلیم..... انگلینڈ﴾

جواب :

صورت مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ میت کو قبر میں دفنانے کے بعد بغیر ضرورت شرعیہ کے قبر سے نکالنا حرام ہے۔ شرعی ضرورت سے مراد وہ امور ہیں جن کی ادائیگی کا تعلق حقوق العباد سے ہو۔ جیسے بغیر اجازت کے کسی کی زمین میں میت کو دفن کر دیا گیا ہو یا دفن کرتے وقت کسی کی کوئی قیمتی چیز قبر میں گر گئی ہو تو ان صورتوں میں قبر کو کھولنا جائز ہے۔

﴿فتاویٰ شامی، جلد ۳ ص ۱۳۲، بدائع الصنائع، جلد ۲ ص ۳۵۷، شرح صحیح مسلم، جلد ۲ ص ۸۱۰﴾

سوال میں جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں کسی بھی صورت کو ”شرعی ضرورت“ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ:

(۱) مسلمانوں کے ساتھ عیسائیوں کا دفن ہونا

(۲) مالک قبرستان کا یہودی ہونا

(۳) اُس کا اپنے کتوں کو کھلا چھوڑ دینا اور کتوں کا ناپاکی پھیلانا

(۴) مالکان کے ساتھ کاغذات پر دستخط کا نہ کرنا

(۵) کسی کا قبروں کے پتھروں کو توڑنا

(۶) مرحوم کی اولاد کا قبر پر جا کر دعا نہ مانگ سکرنا

(۷) میت کو دفناتے وقت امانت نہ کرنا۔

ان میں سے کوئی بھی امر ایسا نہیں ہے جس کی بنیاد پر قبر کو کھولنے اور اس سے مردے کو نکالنے کی اجازت دی جاسکے۔

میت کو کسی جگہ امانتاً دفن کرنے کے بعد بھی قبر سے نکالنا حرام ہے۔ ﴿فتاویٰ رضویہ، جلد ۴/۱۱۶﴾

نیز قبر پر جا کر دعا مانگنا ضروری نہیں ہے، گھر سے بھی دعاء، ایصال ثواب اور فاتحہ وغیرہ کی جاسکتی ہے۔ نیز قبر کو پختہ کرنے کی بھی

شرعاً ممانعت ہے۔

نماز جنازہ کا سلام ہاتھ باندھے ہوئے پھیرے یا ہاتھ چھوڑ کر

سوال :

اکثر دیکھا گیا ہے کہ نماز جنازہ کے اختتام پر بعض لوگ چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ باندھے ہوئے دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں اور پھر دونوں ہاتھ کھولتے ہیں جبکہ بعض لوگ دائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے دایاں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں اور بائیں طرف سلام پھیرتے ہوئے بائیں ہاتھ چھوڑ دیتے ہیں، اور اس کے برعکس بعض لوگ نماز جنازہ کی چوتھی تکبیر کہہ کر دونوں ہاتھ کھول دیتے ہیں اور پھر دونوں طرف سلام پھیرتے ہیں، ان میں سے کون سا طریقہ درست ہے، دلیل کے ساتھ جواب دیجئے۔

﴿مولانا منور احمد۔ ملیر..... محمد ناصر خان چشتی۔ گلشن اقبال﴾

جواب :

امام اہل سنت مولانا احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز سے یہی سوال ان الفاظ میں دریافت کیا گیا کہ: ”نماز جنازہ میں سلام ہاتھ چھوڑنے کے بعد پھیرنا چاہئے یا قبل ہاتھ چھوڑنے کے، افضل کیا ہے؟“ تو آپ نے جواب دیا: ”ہاتھ باندھنا سنت اس قیام کی ہے جس کیلئے قرار ہو، کما فی الدر المختار وغیرہ من الاسفار (یعنی درمختار وغیرہ کتابوں میں ہے)، سلام وقت خروج ہے، اس وقت ہاتھ باندھنے کی طرف کوئی داعی نہیں، تو ظاہر یہی ہے کہ تکبیر چہارم کے بعد ہاتھ چھوڑ دیا جائے۔“ اس کے بعد اس مسئلے کے بارے میں ان سے ”بہار شریعت“ کے حوالے سے سوال کیا گیا تو جواب کے آخری حصے میں آپ لکھتے ہیں: ”ظاہر ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد نہ قیام ذی قرار ہے نہ اس میں کوئی ذکر مسنون، تو ہاتھ باندھے رہنے کی کوئی وجہ نہیں، تکبیر رابع (چوتھی) کے بعد خروج عن الصلوٰۃ کا وقت ہے اور خروج کیلئے اعتماد کسی مذہب میں نہیں ﴿فتاویٰ رضویہ جلد نہم صفحہ ۱۹۴، مطبوعہ رضا فاؤنڈیشن، لاہور﴾

امام احمد رضا قادری کے بیان کیے ہوئے اصول کی تائید درمختار اور ردالمحتار کی اس عبارت سے ہوتی ہے:

” (ولیس بین تکبیراتہ ذکر مسنون) ولذا یرسل یدیه: ای فی اثناء التکبیرات ویضعہما بعد الثالثة کما فی ”شرح

المنیۃ“ لان الوضع سنة قیام طویل فیہ ذکر مسنون۔“

﴿فتاویٰ شامی، جلد ۳، صفحہ ۵۳، ۵۴، مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت، لبنان﴾

”اور عیدین کی زائد تکبیروں کے درمیان ذکر مسنون نہیں ہے، لہذا اپنے دونوں ہاتھوں کو چھوڑ دے، یعنی عیدین کی زائد تکبیرات کے درمیان دونوں ہاتھوں کو چھوڑ دے اور (پہلی رکعت میں) تیسری تکبیر کے بعد باندھ لے، جیسا کہ ”شرح المنیۃ“ میں ہے، کیونکہ ہاتھ باندھنا اس طویل قیام کی سنت ہے جس میں کوئی مسنون ذکر ہو۔“

یہاں تو اصول بیان ہوا، خلاصۃ الفتاویٰ مع مجموعۃ الفتاویٰ مؤلفہ امام طاہر بن عبدالرشید بخاری متوفی ۵۴۲ھ مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۵ پر صراحت و وضاحت کے ساتھ یہ مسئلہ درج ہے، ملاحظہ کیجئے۔

ولا یعقد بعد تکبیر الرابع لانه لا یبقی ذکر مسنون حتی یعقد فالصیح انه یحل الیدین ثم یسلم تسلیمتین
ہکذا فی الذخیرۃ۔

”اور (نماز جنازہ کی) چوتھی تکبیر کے بعد ہاتھ نہ باندھے، کیونکہ اب کوئی ذکر مسنون باقی نہیں رہا کہ بدستور ہاتھ باندھے رکھے، پس صحیح یہی ہے کہ (نماز جنازہ کی چوتھی تکبیر کے بعد) دونوں ہاتھ کھول دے اور دونوں جانب سلام پھیرے، ”ذخیرہ“ میں بھی یہ مسئلہ اسی طرح درج ہے۔“

متعدد جنازے ایک ساتھ کیسے پڑھے جائیں؟

سوال:

اگر ایک وقت میں کئی جنازے جمع ہوں، جن میں مرد، عورتیں اور بچے بھی شامل ہوں۔ تو کیا ان کی نماز جنازہ ایک ساتھ پڑھی جاسکتی ہے؟ اگر پڑھی جاسکتی ہے تو ان کے لئے کون سی دعا پڑھی جائے گی؟
﴿غلام مرشد۔ سندھوئی، آزاد کشمیر﴾

جواب:

علامہ ابن عابدین شامی، فتاویٰ شامی (ردالمحتار ج ۳ ص ۱۱۹-۱۱۸ مطبوعہ مکتبہ امدادیہ) میں لکھتے ہیں: ”اگر ایک وقت میں کئی جنازے جمع ہو جائیں تو ہر ایک کی نماز جنازہ اکٹھے پڑھنے کی بجائے الگ الگ پڑھنا افضل ہے، اور الگ الگ پڑھنے کی صورت میں ان کے ظاہری حالات کے اعتبار سے جو افضل ہو اس کی نماز پہلے پڑھی جائے اور پھر اسی طرح حسب درجہ بدرجہ سب کی پڑھی جائے۔ لیکن اگر سب اموات کی نماز جنازہ بیک وقت پڑھنا چاہیں تو یہ بھی جائز ہے، اگر متعدد جنازے بیک وقت ایک ساتھ پڑھنے کا ارادہ ہو تو اموات کو جنازہ پڑھنے کے لئے رکھنے کی دو صورتیں ہیں:

(۱) یہ کہ اموات کو شمالاً جنوباً ایک لمبی صف میں رکھ دیں اور امام اس میت کے سامنے کھڑا ہو، جو ان سے تقویٰ کے اعتبار سے سب سے افضل ہے اور ظاہر ہے کہ امام اور مقتدی تمام موجود اموات کا جنازہ پڑھنے کی نیت کریں گے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ جنازے شرقاً غرباً امام کے سامنے ایک لائن میں رکھ دیے جائیں اور امام کے سب سے قریب وہ میت ہو جو سب سے افضل ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ اموات کے جنازے رکھے جائیں، یہ صورت نسبتاً بہتر ہے، اسی طرح متعدد اموات ہونے کی صورت میں امام کے قریب پہلے بالغ مردوں کے جنازے ہوں، پھر بچوں کے، پھر خنثی کے (اگر کوئی ہو)، پھر بالغ عورت اور پھر

قریب البلوغ لڑکیوں کے۔ یہی صورت مسئلہ علامہ زین العابدین ابن نجیم نے البحر الرائق میں ج ۲ ص ۱۸۷، پر، علامہ احمد بن محمد الطحطاوی نے حاشیۃ الطحطاوی علی مراقی الفلاح ص ۵۹۲ پر اور شیخ حسن بن عمار نے نور الایضاح میں ص ۱۲۵ پر تحریر کی ہے۔ علامہ طحطاوی نے مزید یہ مسئلہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ نماز جنازہ میں تیسری تکبیر کے بعد جو بالغ میت کی دعا ہے وہ ویسے بھی صیغہ جمع کے ساتھ ہے، لہذا اگر اموات ایک سے زائد ہوں تو سب ہی کو یہ دعا شامل ہو جاتی ہے البتہ اگر متعدد اموات میں چھوٹے بچے بھی ہوں تو بالغ کی دعا کے بعد بچے یا بچی والی دعا بھی پڑھ لینی چاہئے، اگر بچے دو ہوں تو ضمیر ”ہ“ یا ”ھا“ کے بجائے ”ہما“ اور اگر دو سے زیادہ ہوں تو جمع کی ضمیر ”ہم“ پڑھ لیں لیکن اگر صرف بالغ ہی کی دعا پڑھ کر سلام پھیر دیا، تب بھی سب کا جنازہ صحیح ادا ہو جائے گا۔

دعاء بعد الجنازہ

سوال:

ہمارے علاقے میں بعض لوگ عوام کو علی الاعلان یہ کہہ کر گمراہ کرتے ہیں کہ آپ لوگ نماز جنازہ کے بعد میت کے لیے ہاتھ اٹھا کر جو دعاء مغفرت کرتے ہیں اس کا کوئی شرعی ثبوت نہیں اگر ہے تو ہمیں ثبوت پیش کریں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں دلائل کے ساتھ جواب عنایت فرمائیں، نیز جو لوگ علی الاعلان اسے ناجائز کہہ کر عوام کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لیے کیا حکم ہے۔

﴿مولانا نصیر اللہ نقشبندی، نیریاں شریف، آزاد کشمیر﴾

جواب:

اس سوال کا براہ راست جواب سننے سے پہلے ایک دو اصولی باتیں سمجھ لیجئے۔ اسلام اور دنیا کے ہر نظام قانون اور اصول قانون کا ایک بنیادی مسلمہ یہ ہے کہ اشیاء و امور میں اصل اباحت (یعنی جائز ہونا) ہے، لہذا کہیں بھی قوانین کی تشکیل میں مباحات (جائز امور) کا احاطہ نہیں کیا جاتا بلکہ ہر شعبے کے محرمات، ممنوعات اور مکروہات کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا جاتا ہے اور یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کے علاوہ دیگر امور جائز ہیں، مثلاً جن خواتین سے نکاح شرعاً حرام ہے، قرآن نے ان کو سورۃ النساء آیات ۲۲ تا ۲۵ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمادیا ہے اور پھر فرمایا:

واحل لكم ما وراء ذلكم۔ ﴿النساء: ۲۴﴾

اور ان (مذکورہ محرمات) کے علاوہ باقی سب عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح جائز ہے۔

اسی طرح قرآن نے سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۷۳ اور سورۃ النحل آیت نمبر ۱۱۵ میں ماکولات میں سے محرمات (مردار، ذبح کے وقت بہنے والا خون، خنزیر اور جس جانور پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے) کا ذکر فرمایا، احادیث میں اس پر درندے، شکاری پرندے اور

گدھے کا اضافہ فرمایا گیا، بعض دیگر جانوروں کو قیاس و اجتہاد کے ذریعے فقہاء امت نے مکروہ تحریمی قرار دیا، ان کے علاوہ دیگر لاتعداد جانور جو حلال ہیں، کتاب و سنت اور ائمہ مجتہدین نے ان کا تفصیل سے احاطہ نہیں کیا اور نہ ہی ایسا کرنا عملاً ممکن ہے، ہماری عملی زندگی میں اس کی مثال یہ ہے کہ جس سڑک پر دائیں یا بائیں مڑنا منع ہو، یا جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا منع ہو ٹریفک کا عملہ وہاں مخصوص ممانعت کا نشان لگا دیتا ہے، باقی جس جس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانا ممنوع نہیں ہے، وہاں کوئی مخصوص نشان نہیں لگایا جاتا، ممانعت کا نشان نہ ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس گلی یا سڑک پر گاڑی چلانے کی عام اجازت ہے بعینہ یہی اصول احکام شریعت کا ہے، حدیث شریف میں ہے:

عن سلمان قال: سئل رسول الله ﷺ عن أشياء فقال: الحلال ما أحل الله في كتابه والحرام ما حرمه الله في

كتابه وما سكت عنه فهو مما قد عفى عنه فلا تتكلفوا۔ (سنن ابن ماجہ، ص ۲۴۹، سنن ترمذی، ص ۲۱۹)

”حضرت سلمان سے روایت ہے کہ بعض اشیاء (کی حلت و حرمت) کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے (شرعی حکم) دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: حلال وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حلال قرار دے دیا ہے اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دے دیا ہے اور جس کے بارے میں (کتاب و سنت میں) سکوت فرمایا گیا تو وہ معاف ہے۔ (یعنی جائز و حلال ہے) لہذا خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالو۔“

اس حدیث سے کتب تفاسیر و فقہ میں اس مفہوم پر استدلال کیا گیا ہے۔

سنن بیہقی صفحہ ۱۲، جلد نمبر ۱۰، پر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوع ہے:

وما سكت عنه فهو عافية فاقبلوا من الله العافية فان الله يكن نسيّاً ثم قرأ وما كان ربك نسياً۔

”جس چیز (کی حرمت کے بیان) سے قرآن نے سکوت کیا وہ معاف ہے (یعنی جائز ہے) تو اللہ کی طرف سے معافی (یا جواز کی رعایت) کو (خوش دلی سے) قبول کرو کیونکہ اللہ بھولنے والا نہیں، پھر آپ نے (سورہ مریم کی آیت نمبر ۶۴) تلاوت فرمائی (جس کا معنی یہ ہے کہ) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں۔“

فتاویٰ شامی میں ہے:

المختار ان الاصل عند الجمهور من الحنفية والشافعية الاباحة۔ (جلد ۱، ص ۹۸)

”قول مختاریہ ہے کہ جمہور حنفیہ و شافعیہ کے نزدیک (امور و اشیاء میں) اصل اباحت (جائز ہونا) ہے۔

لہذا اگر کوئی شخص، کسی خاص موقع و مقام کے لیے یا علی الاطلاق، کسی چیز کی حرمت یا کراہت کا مدعی ہے تو بار ثبوت اس پر ہے کہ وہ عدم جواز کی شرعی دلیل پیش کرے، نہ کہ فریق مخالف (قائل جواز) سے دلیل طلب کرے۔

دوسرا اصولی مسئلہ یہ کہ فی نفسہ دعاء اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی محبوب اور پسندیدہ فعل ہے، مقاماتِ نجاست و کراہت کے علاوہ دعا کے لیے نہ کسی وقت کی پابندی ہے نہ کسی خاص لب و لہجے اور زبان کی، یہ الگ بات ہے کہ مسنون دعاؤں کی برکات زیادہ ہیں۔ بندے کی دعا اللہ تعالیٰ کو اتنی مرغوب ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے احادیث مبارکہ میں فرمایا:

أَكْثَرُ الدُّعَاءِ - المستدرک، کتاب الدعاء ج ۱ ص ۵۲۹ ﴿﴾

”کثرت سے دعا کیا کرو۔“

الدعاء مخ العبادة - مشکوٰۃ، کتاب الدعوات ﴿﴾

دعاء عبادت کا مغز ہے۔

لا یرد القدر الا الدعاء - مشکوٰۃ، کتاب الدعوات ﴿﴾

دعا تقدیر کو ٹال دیتی ہے۔

سَلُّوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهِ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يُسَالَ - مشکوٰۃ، کتاب الدعوات ﴿﴾

”اللہ سے اس کے فضل کا سوال کیا کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ کوئی اس سے سوال کرے۔“
اور وفات یافتہ اہل ایمان کے لیے دعا کی ترغیب دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا:

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًا لِلَّذِينَ

آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رءوف رحيم ﴿الحشر: ۱۰﴾

”اور جو ان کے بعد آئے وہ (اللہ کی بارگاہ میں) عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ! تو ہمیں بخش دے اور ہمارے ان دینی بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لاچکے ہیں اور ہمارے دلوں میں مومنوں کے لیے کینہ نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بہت مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے۔“

اس آیت کا سیاق و سباق (مورد) تو خاص ہے لیکن اس کا حکم عام ہے اور اپنے اسلاف و سابقین اہل ایمان کے لیے دعاء مغفرت کو اہل ایمان کا شعار قرار دیا گیا ہے۔ اب اس دعاء مغفرت کے لیے کسی وقت خاص کا تعین نہیں ہے، کسی شخص کی زندگی میں بھی اس کے لیے دعاء مغفرت کی جاسکتی ہے، موت کے بعد نمازِ جنازہ سے پہلے بھی کی جاسکتی ہے اور بعد میں بھی کی جاسکتی ہے بطور خاص بعد نمازِ جنازہ ممانعت کی کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو پیش کرے۔ مندرجہ بالا آیت کے تحت علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ لکھتے ہیں: ”متعدد حضرات نے اس پر اجماع نقل فرمایا ہے کہ بلاشبہ دعاء میت کو فائدہ دیتی ہے اور اس کی دلیل کے طور پر اس آیت کو پیش کیا ہے۔“

رہا یہ سوال کہ آیا دعا بعد نماز جنازہ کے لیے کوئی دلیل مثبت بھی ہے؟ تو حدیث شریف میں حضرت ابو ہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے:
اذا صلیتم علی المیت فاخْلِصوا له الدعاء۔

﴿سنن ابی داؤد طبع مجیدی ۱۰۰/۲، سنن بیہقی طبع حیدر آباد ۴۰/۴، سنن ابن ماجہ اصح المطابع ۱۰۹﴾
”جب تم میت پر نماز پڑھ چکو تو اخلاص کے ساتھ اس کے لیے دعا کرو۔“

اس حدیث میں نماز جنازہ پڑھنے کے فوراً بعد دعا کا ذکر ہے کیونکہ اصول فقہ میں یہ طے ہے کہ ”ف“ ”تَعْقِيبُ عَلَى الْفَوْرِ“ کے لیے آتی ہے، یہ اس کے حقیقی معنی ہیں اور کسی عقلی، عادی یا شرعی دلیل کے بغیر حقیقی معنی سے عدول جائز نہیں ہے، لہذا اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز جنازہ کے فوراً بعد میت کے لیے اخلاص کے ساتھ دعا مانگو۔“
امام علاؤ الدین ابوبکر بن مسعود کا سانی حنفی لکھتے ہیں:

ولنا: ماروی ان النبی ﷺ صلی علی جنازة فلما فرغ، جاء عمرو معه قوم، فأراد ان یصلی ثانیاً فقال له النبی ﷺ:
الصلوة علی الجنازة لاتعاد“ ولكن أدع للمیت واستغفر له وهذا نص فی الباب، وروی ان ابن عباس و ابن عمر ﷺ
فاتھما صلوة علی الجنازة فلما حضرا ما زادا علی الاستغفار له وروی عن عبد اللہ بن سلام ﷺ: انه فاتته الصلاة
علی جنازة عمر ﷺ، فلما حضر قال: ان سبقتونی بالجنازة فلا تسبقونی بالدعاء له۔

(”یہ مسئلہ کہ نماز جنازہ کی تکرار نہیں ہے) اس میں ہماری دلیل یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک شخص کی نماز جنازہ پڑھائی جب حضور ﷺ جنازہ پڑھا کر فارغ ہو چکے تو اس وقت حضرت عمر کچھ لوگوں کے ساتھ آئے اور دوبارہ نماز جنازہ پڑھنے کا ارادہ کیا تو حضور نے (انہیں تکرار جنازہ سے روکتے ہوئے) فرمایا: نماز جنازہ دوبارہ نہیں پڑھی جائے گی لیکن میت کے لیے دعا کرو اور اس کے لیے استغفار کرو، یہ اس باب میں (کہ نماز جنازہ کی تکرار نہیں) نص ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ ابن عباس اور ابن عمر ﷺ سے ایک نماز جنازہ نکل گئی (یعنی وہ دیر سے پہنچے) پس جب وہ میت کے پاس آئے تو صرف دعاء مغفرت پراکتفا کی، اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلام سے حضرت عمر ﷺ کی نماز جنازہ نکل گئی۔ جب وہ آئے تو انہوں نے (جنازے پر موجود حاضرین سے) کہا کہ اگرچہ تم لوگ مجھ سے نماز جنازہ میں پہل کر چکے ہو لیکن دعائیں مجھ سے پہل نہ کرو (یعنی دعائیں مجھے بھی شریک ہونے دو)۔“

﴿بدائع الصنائع جلد ۳، ص ۳۳۸ دارالکتب العلمیہ بیروت﴾

ان احادیث مبارکہ سے صراحت کے ساتھ یہ ثابت ہو رہا ہے کہ عہد رسالت و عہد صحابہ میں نماز جنازہ کے بعد میت کے لیے دعا کا معمول تھا۔ مبسوط سرخسی میں بھی یہ روایات موجود ہیں۔

”دعاء بعد الجنازة“ کے ثبوت کا مسئلہ ہم نے دلائل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، ہم اس کے فرض، واجب یا سنت قرار دینے کے مدعی

نہیں ہیں بلکہ جواز اور استحباب کے مدعی ہیں کہ جتنے زیادہ مواقع پر اور جتنی زائد بار میت کے لیے دعا کی جائے وہ اس کے لیے مفید ہے اور خود دعا کرنے والے کے لیے بھی وسیلہ اجر ہے، لیکن اگر کوئی شخص بطور خاص نماز جنازہ کے بعد میت کے لیے دعاء مغفرت و ایصالِ ثواب کو خلاف سنت یا بدعت قرار دیتا ہے تو وہ عدم جواز کی دلیل پیش کرے۔ اصولاً بار ثبوت اس کے ذمے ہے کہ کہاں اور کب رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ اس کے برعکس روایات و آثار سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ جلد ثالث صفحہ ۳۳۱ پر ہے:

عن عمیر بن سعید قال صلیت مع علی یزید بن مکلف فکبر علیہ اربعاً ثم مشی حتی اتاه وقال: اللّٰهُمَّ عبدك و

ابن عبدك نزل بك اليوم فاغفر له ذنبه ووسع عليه مدخله فاننا لا نعلم منه الا خيراً وانت اعلم به۔

”عمیر بن سعید بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کے ساتھ یزید بن مکلف کی نماز جنازہ پڑھی، انہوں نے ان پر (جنازے کی) چار تکبیرات پڑھیں، پھر چلے یہاں تک کہ میت کے قریب آ گئے اور عرض کیا: اے اللہ! (یہ) تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا فرزند ہے آج تیرے حضور حاضر ہے تو تو اس کے گناہوں کو معاف فرما، اس کی قبر کو اس کے لیے وسیع فرما، ہم اس کے بارے میں خیر کے سوا کچھ نہیں جانتے اور تو اس (کے حال) کو بہتر جانتا ہے۔“

﴿کتاب الزکوۃ﴾

زکوۃ

اہمیت، فضیلت، مسائل

توحید و رسالت کی شہادت اور نماز کے بعد زکوۃ اسلام کا تیسرا بنیادی رکن ہے۔ یہ خالص مالی عبادت ہے جو تمام انبیائے کرام اور رسلِ عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شریعتوں کا لازمی جز رہی ہے۔ جس طرح انسان کو جسمانی امراض اور عوارض لاحق ہوتے ہیں، اسی طرح روحانی اور اخلاقی امراض بھی لاحق ہوتے ہیں، ان میں بہت نمایاں اخلاقی بیماری، حب مال اور کثرتِ مال کی خواہش ہے، جس کے نتیجے میں انسان کے دل میں تکبر، حرص، بخل، ہوس اور خود غرضی کی صفاتِ رذیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ عربی میں مال کو مال کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس کی طرف قلبِ انسانی بہت جلد مائل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے فرمایا:

﴿التغابن: ۱۵﴾ **إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ**

”تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے آزمائش ہیں۔“

ان اخلاقی امراض کے ازالے کے لئے اللہ جل شانہ نے عبادتِ زکوۃ فرض کی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿التوبة: ۱۰۳﴾ **خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا۔**

”(اے حبیب!) آپ مومنوں کے مال سے صدقہ (زکوۃ) لیجئے تاکہ اس کے ذریعے آپ ان کے ظاہر و باطن کو پاک و صاف

کریں۔“

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿الیل: ۱۷، ۱۸﴾ **وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتَقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝**

”اور آتش دوزخ سے وہ نہایت متقی بندہ دور رکھا جائے گا، جو اپنا مال اس لئے (اللہ کی راہ میں) دیتا ہے کہ (اس کا قلب) پاک

ہو جائے۔“

زکوۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے قرآنی وعیدیں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا أَنَّهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ط بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ط سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ

الْقِيَمَةِ ط ﴿آل عمران : ۱۸۰﴾

”اور جو لوگ اس مال میں، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انہیں عطا فرمایا ہے، بخل کرتے ہیں (اور اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے)، وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ایسا مال ان کے حق میں خیر ہے بلکہ یہ ان کے لئے شر ہے اور غریب (قیامت کے دن) ان کے گلے میں بخل سے جمع کئے ہوئے مال کا طوق پہنایا جائے گا۔“

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فُتُكُوٰى بِهَا بَهَا۟هُمُ وَجُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ط هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝

﴿التوبة : ۳۴، ۳۵﴾

”اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے تو (اے نبی!) انہیں اس دن کے دردناک عذاب کی وعید سنائیے جب ان کے اپنے جمع کئے ہوئے مال کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور پھر اس سے ان کی پیشانیاں، پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) یہ ہے اس مال کا انجام جسے تم نے (بے پناہ چاہت سے) جمع کیا تھا، تو اب اپنے (اُس) مال کا مزہ چکھو جو تم (دنیا میں بخل سے) جمع کیا کرتے تھے۔“

انسان کی جان و مال ہر چیز کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے، انسان کی طرف مال و دولت اور اشیاء کی ملکیت مجازاً ہوتی ہے، انسان کو شریعت کی مقررہ حدود کے اندر اپنی جان و مال پر تصرف کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہ شرعی قیود مال کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر ہر جہت سے عائد ہوتی ہیں حلال و حرام اور کسب مال و صرف مال کے شرعی احکام اسی مقصد کے لئے ہیں اور قیامت کے دن اسی کی باز پرس ہوگی۔ انسان بعض اوقات اپنی بیوی بچوں اور اہل و عیال کی جائز و ناجائز فرمائشوں اور خواہشات کی تکمیل کی خاطر ان شرعی احکام کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور پھر ایک دن داعی اجل کو لبیک کہنا پڑتا ہے، سارا جمع شدہ مال دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ مال پر وارث دادِ عیش دیتے ہیں اور حسابِ قبر میں مردے کو دینا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَلْهَكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ ﴿التكاثر : ۱-۲﴾

”تمہیں کثرتِ مال کی خواہش نے (آخرت کی جواب دہی سے) غافل کر دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں میں جا کر (اس کا

انجام) دیکھ لو گے۔“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ﴿١٨﴾ الحشر: ١٨

”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو اس امر کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ اس نے کل (آخرت) کے لئے کیا آگے بھیجا ہے۔“

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعُ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ﴿٢٥٤﴾ البقرة: ٢٥٤

”اے ایمان والو! ہمارے دیئے گئے مال میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو، اس یوم (جزا) کی آمد سے قبل، جبکہ (دولت کے بل پر) نہ نیکیوں کو خریداجا سکے گا، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ ہی سفارش چلے گی۔“

اللہ تعالیٰ کی ذات کتنی رحیم و کریم ہے کہ وہ خود اپنے بندے کو مال و دولت سے نوازتا ہے اور پھر امتحان کے طور پر اس سے فرماتا ہے:

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَاقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا ط وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرًا

وَأَعْظَمَ أَجْرًا ﴿٢٠﴾ المزمّل: ٢٠

”اور نماز قائم کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ کو قرض حسن دو اور جو بھی عمل خیر تم (زکوٰۃ و صدقات کی صورت میں اپنی عاقبت کے لئے) آگے بھیجو گے، تو اسے اللہ کی بارگاہ میں (بدرجہا) بہتر اور بہت بڑے اجر کی صورت میں پاؤ گے۔“

لہذا قرآن مجید کی ان آیات مقدسہ کی تعلیم یہ ہے کہ بندہ مومن کو اپنی کمائی میں سے اپنا حصہ نکال کر اللہ تعالیٰ کی امان و حفاظت میں دینا چاہئے، امام رازی سے کسی نے پوچھا کہ اگر کوئی چاہے کہ اس کا سارا مال اس کے ساتھ قبر میں جائے تو اس کی خواہش کی تکمیل کیسے ممکن ہے؟ انہوں نے فرمایا: ”وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دے، وہ سارا کا سارا اجر کثیر کی صورت میں اسے مل جائے گا۔ ایک حدیث پاک میں ہے کہ ایک بار کا شانہ نبوت میں ایک بکری ذبح کی گئی، حضور اکرم ﷺ شام کو گھر واپس تشریف لائے تو آپ نے دریافت فرمایا کچھ بچا ہے؟ گھر والوں نے عرض کیا، ایک دست بچا ہے، باقی خرچ ہو گیا، یعنی اللہ کے نام پر صدقہ کر دیا ہے، آپ نے فرمایا اس طرح نہ کہو، بلکہ یوں کہو جو اللہ کے نام پر دے دیا وہ بچ گیا ہے، (یعنی آخرت کے لئے) اور جو گھر والوں کے لئے بچا ہے وہ خرچ ہو گیا ہے۔“

زکوٰۃ کی تشخیص، ادائیگی اور مصارف کے پیچیدہ مسائل

زکوٰۃ کا مفہوم

لغت میں زکوٰۃ کا معنی پاکیزگی، نمو، اضافہ اور برکت ہے۔ مال اور دولت سے انسان میں حرص، بخل، تکبر، تہر و فتن و فجور کی

صفاتِ رذیلہ پیدا ہوتی ہیں۔ مالی عبادات کے طور پر اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ فرض کی ہے تاکہ انفاق فی سبیل اللہ سے ان اخلاقی امراض کا ازالہ ہو اور انسان میں قناعت، جود و سخا، انکسار اور تقویٰ و حسن عمل کی اعلیٰ صفات پیدا ہوں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”ان کے اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے ان (کے قلب و ذہن) کا تزکیہ کیجئے (سورۃ توبہ) قرآن کی رو سے زکوٰۃ ادا کر کے مالدار، مفلس و نادار پر احسان نہیں کرتا بلکہ وہ حقدار کو اس کا حق لوٹاتا ہے جو مال و دولت عطا کرنے والے رب کریم نے اس کے مال میں شامل کر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ الذریت : ۱۹ ﴿﴾

”اور ان (مالداروں) کے مال میں سائل اور مال سے محروم لوگوں کا حق ہے۔“

گویا قرآن مجید کا پیغام یہ ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود زکوٰۃ ادا نہیں کرتا وہ حق تلفی کرنے والا، ظالم اور غاصب ہے، کیونکہ وہ نادار کے حق کو لوٹانے سے عملاً منکر ہے۔

وجوب زکوٰۃ

مالدار پر زکوٰۃ فرض ہونے کی شرائط یہ ہیں: اسلام، عاقل ہونا، بالغ ہونا، نصاب شرعی کا مالک ہونا (یعنی صاحبِ نصاب ہونا) اور نصاب پر پورا ایک قمری سال گزر جانا۔

نصاب زکوٰۃ

اس سے مراد وہ کم از کم مالیت ہے، جس کا مالک ہونے سے مسلمان پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے اور نصاب شرعی کی مقدار یہ ہے 612.36 گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم، یا مال تجارت جو اس کی حاجتِ اصلیہ سے زائد ہو، یا 87.48 گرام سونایا اس کی رائج الوقت قیمت کے مساوی نقد رقم یا مال تجارت جو اس کی حاجتِ اصلیہ سے زائد ہو۔ آج کل چاندی اور سونے کے نصاب کی مالیت میں تقریباً ایک اور سات کی نسبت ہے۔ فقہائے کرام نے کہا ہے کہ اگر اموال متفرق ہوں (یعنی کچھ سونا اور کچھ چاندی اور دیگر اموال) یا صرف چاندی، تو چاندی ہی کے نصاب کا اعتبار ہوگا تاکہ ناداروں کو فائدہ ہو۔

حولانِ حول کا مفہوم

وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ضروری ہے کہ مال پر سال گزر جائے، اسے فقہی اصطلاح میں ”حولانِ حول“ کہتے ہیں۔ شریعت کی رو سے جس دن کوئی بالغ مسلمان مرد یا عورت زندگی میں پہلی بار مندرجہ بالا تفصیل کے مطابق کم از کم نصاب کا مالک ہو جائے تو اسلامی کیلنڈر کی اسی تاریخ

سے وہ ”صاحبِ نصاب“ قرار پاتا ہے۔ لیکن اس پر اسی دن سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تا وقتیکہ اس نصاب پر اس کی ملکیت میں پورا ایک قمری سال گزر نہ جائے، تاہم یہ امر پیش نظر رہے کہ سال بھر کے دوران ”صاحبِ نصاب“ کی ملکیت میں کم از کم نصاب کارہنا ضروری ہے، ہر مال پر (خواہ وہ نقد رقم ہو یا سونا چاندی کی صورت میں ہو یا صنعت و تجارت کا مال ہو) سال گزرنا زکوٰۃ واجب ہونے کے لئے لازمی نہیں ہے، اگر مال کے ہر جز پر سال گزرنے کی شرط کو لازمی قرار دیا جائے تو تاجر حضرات کیلئے زکوٰۃ کا حساب نکالنا (Assessment) تقریباً ناممکن العمل ہو جائے، کیونکہ مال کی آمد و خرچ کا سلسلہ روز جاری رہتا ہے، بلکہ تنخواہ دار آدمی بھی ہر ماہ کی تنخواہ سے کچھ پس انداز کرتا ہے لہذا مال کے ہر حصے کی مدت الگ ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا تشریح کی رشتی میں زکوٰۃ کی تشخیص کی مقررہ تاریخ سے چند دن قبل بھی اگر مال ”صاحبِ نصاب“ کی ملکیت میں آجائے تو اسے پہلے سے موجودہ مال میں شامل کر کے کل مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

مسلمان تاجر کی ملکیت میں جو بھی مال ہے، یعنی نقد رقم، بینک اکاؤنٹ، بانڈز، ڈیپازٹس، سونا چاندی اور مال تجارت وغیرہ، سب کی مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی غرض سے سونا، چاندی اور مال تجارت کی وہ قیمت معتبر ہے جو وجوب زکوٰۃ کے وقت ہوگی، یعنی قیمت خرید کا اعتبار نہیں ہے۔ لہذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان تاجر کو وجوب زکوٰۃ کی مقررہ تاریخ پر اپنے مال تجارت کی محتاط اسٹاک چیکنگ اور قدر (Valuation) یعنی صحیح قیمت کا تعین کرنا چاہئے۔

صنعت کاروں کی تشخیص

وہ کارخانہ جو پیداواری مقاصد کے لئے استعمال ہو رہا ہے، اس کی زمین، عمارت، متعلقہ تنصیبات اور مشینری کی قیمت پر جو صنعتی پیداواری مقاصد میں استعمال ہو رہی ہے، زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ البتہ مسلمان صنعت کار کو اپنے دیگر تمام اموال کے ساتھ کارخانے میں موجود خام مال تیار مال اور مارکیٹ میں کریڈٹ پر دیئے ہوئے تمام مال کی بھی زکوٰۃ کرنی ہوگی۔

تشخیص زکوٰۃ کے وقت واجب الادا قرض کا مسئلہ

تاجر حضرات کا اکثر مارکیٹ میں لین دین جاری رہتا ہے، کسی سے کچھ لینا ہے اور کسی کو کچھ دینا ہے، تجارت سے ہٹ کر بعض اوقات لوگوں کا شخصی لین دین بھی ہوتا ہے۔ لہذا تشخیص زکوٰۃ کے وقت واجب الوصول رقم کو اپنی مالیت میں جمع کر کے اس سے واجب الادا رقم کو منہا کر دیا جائے۔ اس کے بعد جو مجموعی مالیت بنے گی اس پر زکوٰۃ دی جائے گی۔

طویل مبعادی قرض اور صنعتی قرض کا مسئلہ

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کا قرض، بعض صنعتی اور تجارتی قرضوں کی ادائیگی فی الفور لازم نہیں ہوتی بلکہ وہ پانچ، دس، پندرہ

سال یا اس سے بھی زائد مدت پر محیط ہوتے ہیں، ماہانہ یا سالانہ اقساط واجب الادا ہوتی ہیں۔ فوری ادائیگی کا نہ قرض خواہ مطالبہ کرتا ہے اور نہ مقروض فرد فوری طور پر قرض سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ اپنی ملکیت میں رقم ہونے کے باوجود مقررہ اقساط سے زیادہ ادا نہیں کرتا، ورنہ یہ سوال زیر بحث آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ایسے قرضوں کے بارے میں ہمارے فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ یہ وجوبِ زکوٰۃ اور ادائیگی میں مانع نہیں ہیں۔ اس کی ایک مثال فقہاء نے بیوی کے مہر مؤجل کی دی ہے کہ بیوی مطالبہ نہیں کرتی اور شوہر کا عمل اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ سر دست ادا نہیں کرنا چاہتا، لہذا شوہر تشخیصِ زکوٰۃ کے وقت ایسے دین مہر کو اپنی کل مالیت سے منہا نہ کرے۔ میعادِ قرضوں کی نوعیت بھی اس سے مختلف نہیں ہے، اسی طرح طویل المدتی صنعتی قرضوں کا معاملہ ہے، ایک طرف تو ان قرضوں کے مقابل اتنی یا اس سے زیادہ مالیت کے اثاثے موجود ہوتے ہیں، صنعت بیمار قرار پاتی ہے۔ لیکن صنعت کار کی مالی صحت پر اس کے اثرات مرتب نہیں ہوتے، اس کے بنگلے، ذاتی اثاثے، جائیدادیں، کاریں، غیر ملکی مہنگے سفر پوری شان کے ساتھ قائم و دائم رہتے ہیں۔ ان کے اور ان کے اہل و عیال کی بود و باش اور رہن سہن انتہائی تمول کی سطح پر نظر آتے ہیں۔ کچھ ہمارے ملکی قوانین، انکم ٹیکس وغیرہ کے پیچیدہ قوانین، بیوروکریسی کے بے کراں صوابدیدی اور انضباطی اختیارات، ایسی وجوہ ہیں کہ کالے دھن اور سفید دھن کا مسئلہ آج تک حل نہیں ہو پایا۔ ہمارے اہل ثروت اور صنعت کاروں کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ معاملہ شفاف رکھنا چاہئے اور طویل المدتی قرضوں کو منہا کئے بغیر اپنی پوری مالیت پر زکوٰۃ ادا کرنی چاہئے تاکہ کل قیامت کے دن اپنے ہی جمع کردہ مال سے نہ داغے جائیں۔

مکان، دکان، فلیٹس اور پلاٹوں پر زکوٰۃ

ذاتی استعمال کا مکان زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے، اسی طرح ذاتی مکان کے لئے خریدا ہوا پلاٹ بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہے۔ وہ مکان، یا پلاٹ یا دکانیں، فلیٹس جو کرائے پر چڑھے ہوئے ہیں، ان کی سالانہ آمدنی وضعِ مصارف کے بعد مالکِ جائیداد کی مجموعی سالانہ آمدنی میں جمع ہوگی اور تمام ذرائعِ آمدن سے سال کے اختتام پر جو رقم پس انداز ہوگی، اس سب پر زکوٰۃ ہے۔ ایسے مکانات، پلاٹس، دکانیں یا فلیٹس جو کاروباری اور تجارتی مقاصد کے لئے ہیں، یعنی نفع کمانے کی غرض سے، ان سب کی مالیت پر زکوٰۃ ہے، اور اس میں قیمتِ خرید کا اعتبار نہیں ہے بلکہ موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ بطور انویسٹمنٹ پلاٹس اور جائیدادیں خریدنے والوں کے لئے یہ سب سے زیادہ قابلِ توجہ مسئلہ ہے۔ کرائے پر دیئے ہوئے مکان، دکان، فلیٹس وغیرہ کے ڈیپازٹ کی جو رقم جائیداد کے مالک کے پاس بطور ضمانت جمع ہے، اس کی زکوٰۃ رقم کا اصل مالک (کرایہ دار) ادا کرے گا، اسی طرح تاجر حضرات اور ایجنسی ہولڈرز کی جو رقم بطور ضمانت (Security Deposits) کسی ادارے یا فرم کے پاس جمع ہیں اور قابلِ واپسی ہیں، اس رقم کی زکوٰۃ بھی اصل مالک یعنی (Depositer) کو ادا کرنی ہوگی۔ اگر صاحبِ نصاب کے قرض کی رقم پھنسی ہوئی ہے اور مقروض نادہندہ ہے لیکن اس کی واپسی کی آس قائم ہے تو اس کی زکوٰۃ

دے دینی چاہئے، اگر نہ دی تو ملنے پر گزشتہ ساری مدت کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ البتہ قرض کی ڈوبی ہوئی رقم کی زکوٰۃ اگر نہ دی تو وہ جواب دہ نہیں ہوگا۔

استعمال کے زیورات پر زکوٰۃ

سونا اور چاندی از روئے شریعت خلقی طور پر (In Born) مال ہیں، لہذا یہ کسی بھی ہیئت (Form, Shape) میں ہوں، ان پر زکوٰۃ واجب ہے۔ مثلاً برتن، مالیاتی سکے (Coins) سونے یا چاندی کی ڈلی (Gold Bullion) استعمال کے زیورات وغیرہ۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن (Grasping) تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کیا: نہیں، حضور ﷺ نے فرمایا: تو کیا تم اس بات پر خوش ہوگی کہ اللہ تعالیٰ (زکوٰۃ نہ دینے کی بناء پر) ان کنگنوں کے عوض قیامت کے دن تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟ یہ (وعید عذاب) سنتے ہی اس نے وہ کنگن اتار کر رسول اللہ ﷺ کو دے دیئے اور عرض کیا کہ یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی راہ میں صدقہ ہیں۔“

﴿سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی﴾

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں سونے کے ”اوضاح“ (ایک خاص زیور کا نام ہے) پہنتی تھی، میں نے اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا یہ بھی اس کز میں شامل ہے (جس پر سورۃ توبہ آیت: ۳۴-۳۵ میں عذاب جہنم کی وعید آئی ہے)؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جو سونے کے زیورات اتنی مقدار کو پہنچ جائیں کہ ان پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور پھر ان کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو ان پر کز کا اطلاق نہیں ہوتا۔“

﴿سنن ابی داؤد، مؤطا امام مالک﴾

ان احادیث مبارکہ سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ استعمال کے زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے، کیونکہ دونوں خواتین نے سونے کے زیورات پہن رکھے تھے۔

اگر سونا یا چاندی مخلوط (Mixed) ہو اور کسی اور چیز کی ملاوٹ اس میں ہو تو غالب جز کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر شے مخلوط میں غالب مقدار سونا ہے تو اسے سونا قرار دے کر ان کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی ورنہ نہیں، البتہ ہیرے اور دوسرے قیمتی پتھر مثلاً زمرد، عقیق، یاقوت وغیرہ اگر تجارت کے لئے ہیں تو ان پر زکوٰۃ ہے، ذاتی استعمال میں ہوں تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

بچوں کی شادی کے لئے مختص زیورات پر زکوٰۃ

اگر صاحب نصاب نے اپنے بالغ بیٹوں یا بیٹیوں کی شادی کے لئے زیورات بنا کر رکھے ہوئے ہیں، تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے اولاد کو اس کا مالک بنا دیا ہے، دوسری یہ کہ بدستور اس کی ملک میں ہیں، جو بھی صورت ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

حج کے لئے جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

اگر کسی نے حج کے لئے رقم جمع کر رکھی ہے اور نیت یہ ہے کہ اس رقم کو حج پر صرف کرے گا تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہاں البتہ اگر حکومت کے پاس اس مد میں جمع کرادیئے ہیں تو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔

پھنسا ہوا قرض زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوتا

اگر مقرض نادہند اور نادار ہے تب بھی پھنسی ہوئی رقم کے لئے یہ نیت کر لینا کہ وہ زکوٰۃ میں عند اللہ محسوب ہو جائے، ایسی نیت کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ ابتداءً نادار کو دیتے وقت زکوٰۃ کی نیت نہ کی جائے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اب اسے زکوٰۃ کی رقم دے دے اور مقرض اس رقم کا مالک بن کر ادائے قرض میں اسے واپس کر دے، یہ شرعاً جائز ہے لیکن یہ آزادانہ تصرف ہوگا، زکوٰۃ دیتے وقت یہ شرط عائد نہیں کی جاسکتی۔ نیز فقہائے کرام نے ادائے زکوٰۃ میں اس امر کو مستحسن قرار دیا ہے کہ زیادہ فقراء کو فائدہ پہنچایا جائے۔ لہذا کسی ایک مستحق کو زکوٰۃ کی بھاری رقم دے دینا جائز تو ہے لیکن شرعاً پسندیدہ امر نہیں ہے۔

زکوٰۃ کہاں صرف کی جائے؟

امام بخاری نے ایک طویل حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ ”زکوٰۃ ان (مسلمانوں) کے مالداروں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دی جائے۔“ اس حدیث کی روشنی میں فقہائے کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ مال زکوٰۃ کو خرچ کرنے میں افضل یہ ہے کہ جس مقام پر زکوٰۃ وصول کی جائے، وہیں کے فقراء اور ناداروں پر صرف کی جائے، البتہ مندرجہ ذیل صورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں: (۱) یہ کہ اس مقام پر کوئی مستحق نہ ہو جیسے امریکا، یورپ یا بعض متمول مسلم ممالک میں ایسا ممکن ہے (۲) یا زکوٰۃ ادا کرنے والے کے مستحق قریبی رشتہ دار کسی دوسرے مقام پر رہتے ہوں۔ (۳) یا کسی جگہ کے مسلمان بہت زیادہ نادار اور ضرورت مند ہوں تو ان صورتوں میں دوسرے مقامات پر بھی زکوٰۃ کی رقم بھیجی جاسکتی ہیں لیکن مقامی مستحقین کو بالکل نظر انداز کر کے دوسرے مقامات پر زکوٰۃ کی رقم بھیجنا شرعاً قابل ترجیح اور پسندیدہ امر نہیں ہے، اگرچہ ایسا کرنے سے اصولی طور پر زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کا سب سے اہم شعبہ

قرآن نے فرضیت زکوٰۃ کو تو وضاحت کے ساتھ متعدد مقامات پر بیان کیا ہے، لیکن نصاب زکوٰۃ، شرائط وجوب زکوٰۃ اور شرح زکوٰۃ کی تفصیلات بیان نہیں کیں۔ یہ تمام تفصیلات احادیث میں ملتی ہیں، البتہ جس شعبہ عز کو قرآن نے سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ مصارف زکوٰۃ کا شعبہ ہے۔ چنانچہ سورۃ توبہ آیت: ۶۰ میں ان آٹھ مصارف کی تصریح کر دی گئی ہے جن پر زکوٰۃ صرف کی جاسکتی ہے اور وہ یہ ہیں: (۱) فقراء (۲) مساکین (۳) عاملین زکوٰۃ (۴) مؤلفۃ القلوب (۵) جن کو طوق غلامی سے آزاد کرنا

مقصود ہو (۶) جو بارِ قرض تلے دبے ہوئے ہوں یا ان پر کوئی تاوان آپڑا ہو (۷) جنہوں نے کل وقتی اپنے آپ کو دین کی نصرت و حفاظت کے لئے وقف کر رکھا ہو (۸) ایسے مسافر جن کا گھر سے رابطہ منقطع ہو چکا ہو۔

سنن ابوداؤد کی ایک طویل حدیث میں زیاد بن حارث صدائی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ عنایت فرمائیے! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مصارفِ زکوٰۃ کے معاملے کو کسی نبی یا غیر نبی کی مرضی پر نہیں چھوڑا بلکہ خود ہی فیصلہ فرمادیا ہے اور اس کی آٹھ اقسام بیان کی ہیں، اگر تم ان میں سے کسی قسم کے تحت حقدار بنتے ہو تو میں زکوٰۃ میں سے تم کو دے دوں گا (ورنہ نہیں)۔ لہذا زکوٰۃ نکالنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل مستحقین تک پہنچانا اور جائز شرعی مصارف پر صرف کرنا بھی لازم ہے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ ہمارے معاشرے میں جمع و صرفِ زکوٰۃ کی بعض صورتیں رائج ہیں جو شرعاً درست نہیں ہیں۔

مدارس تعلیم القرآن

بعض جگہ مقامی طور پر مساجد میں یا بعض دینی، تبلیغی اور رفاہی تنظیموں کے تحت مکاتبِ تعلیم القرآن کا ایک نیٹ ورک قائم کیا گیا ہے، ان مدارس و مکاتب میں ان مقامی لوگوں کے بچے حفظ و ناظرہ کی تعلیم حاصل کرتے ہیں جو زکوٰۃ یا فطرہ ان اداروں کو دیتے ہیں، ان مدارس و مکاتب کے معلمین کے مشاہرے ادا کرنے کے لئے زکوٰۃ، فدیہ، عصوم، نذر، کفارہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ ایسے مصرف کے لئے زکوٰۃ لینا اور دینا جائز نہیں، کیونکہ یہ خود اپنی زکوٰۃ سے استفادہ کی بالواسطہ صورت ہے۔ البتہ وہ دینی مدارس و جامعات جن میں مستحق اقامتی طلباء دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں، وہ زکوٰۃ، فطرہ و صدقات واجبہ کا بہترین مصرف ہیں۔

کمیونٹیز اور برادریوں کے رفاہی فنڈ

بعض کمیونٹیز، برادریوں، مخصوص خاندانی یا علاقائی وحدت کے لوگوں نے اپنی کمیونٹی یا برادری کے افراد کے لئے رفاہی فنڈ قائم کر رکھے ہیں، فاؤنڈیشن یا ٹرسٹ کی صورت میں، اس فنڈ میں زکوٰۃ، فطرہ اور چرم قربانی وغیرہ کی رقوم جمع کی جاتی ہیں۔ اس فنڈ سے برادری یا کمیونٹی کے افراد کو آسان شرائط پر قرض دیئے جاتے ہیں۔ خرچ کرتے وقت مستحق زکوٰۃ کے شرعی معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، یہ طریقہ کار شرعاً درست نہیں ہے۔ اول تو زکوٰۃ جب تک مستحق تک نہیں پہنچے گی محض برادری کے فنڈ میں جمع ہونے سے ادا نہیں ہوگی۔ دوم یہ کہ فطرہ و زکوٰۃ کی رقم جب تک الگ مد میں رکھ کر تملیک کے شرعی اصول کے مطابق مستحق فرد کو ادا نہیں کی جائے گی، ادا نہیں ہوگی۔ مندرجہ بالا مقاصد بلاشبہ لائق تحسین ہیں، لیکن ان کے لئے صدقات واجبہ یعنی زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ وغیرہ سے الگ نفلی صدقات اور انفاق فی سبیل اللہ کی عمومی رقوم اور عطیات وغیرہ پر مشتمل ”بلیفیر فنڈ“ قائم کرنا چاہئے۔ جس کے صرف پر زکوٰۃ، فطرہ والی پابندیاں عائد نہیں ہوں گی۔

مساجد کی تعمیر و مصارف پر زکوٰۃ خرچ کرنا

مساجد کی تعمیر اور مصارف جاریہ پر زکوٰۃ و فطرہ کی رقم خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض لوگ ان مقاصد کے لئے حیلہ کا سہارا لیتے ہیں، یہ حیلہ کا غلط استعمال ہے اور اس سے منشاء شریعت کو باطل کرنا مقصود ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری ج ۱۲ ص ۳۲۶ پر لکھتے ہیں:

کسی خفیہ طریقہ سے مقصود حاصل کرنے کو حیلہ کہتے ہیں، علما کے نزدیک اس کی کئی اقسام ہیں:

- (۱) اگر جائز طریقے سے کسی کا حق (خواہ اللہ کا حق ہو جیسے زکوٰۃ یا بندے کا حق) باطل کیا جائے یا کسی باطل (مثلاً سود، رشوت، پگڑی وغیرہ) کو حاصل کیا جائے تو یہ حیلہ حرام ہے۔ (۲) اگر جائز طریقے سے کسی حق کو حاصل کیا جائے یا کسی ظلم یا باطل کو دفع کیا جائے تو حیلہ مستحب یا واجب ہے (۳) اگر جائز طریقے سے کسی ضرر سے محفوظ رہا جائے تو یہ حیلہ مباح ہے (۴) اگر جائز طریقے سے کسی مستحب کو ترک کرنے کا حیلہ کیا جائے تو یہ مکروہ ہے۔

ہسپتالوں میں زکوٰۃ سے نادار مریضوں کا علاج

رفاہی ادارے جو مریضوں کے علاج کے لئے زکوٰۃ کی رقم جمع کرتے ہیں، وہ اگر حد و شرع میں رہ کر زکوٰۃ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو اس کی چند صورتیں یہ ہیں:

- (۱) جو دوا نادار مستحق زکوٰۃ کی ملک میں دے دی جائے گی وہ جائز ہے (۲) ڈاکٹر کی فیس، بیڈ کے کرائے، ایکس رے، میڈیکل ٹیسٹ وغیرہ پر جو خرچ آئے، وہ مریض خود ادا کرے اور استحقاق کے تعین کے بعد شعبہ زکوٰۃ سے مریض کو ان مصارف کے عوض کل یا گنجائش کے تناسب سے جتنی رقم دی جاسکتی ہے، دے دی جائے (۳) زکوٰۃ و فطرہ یعنی صدقات واجبہ کی رقم صرف مستحق مریضوں کو دی جائے، غیر مسلم نادار مریضوں کے لئے الگ سے ”ویلفیئر فنڈ“ قائم کیا جائے جو عطیات پر مشتمل ہو (۴) چند سال پیشتر جب مرکزی زکوٰۃ کونسل کے ایک رکن نے ایک رفاہی ادارے کا معائنہ کیا تھا تو انہوں نے زکوٰۃ کے حوالے سے بہت سے ناقص پہلوؤں کی نشاندہی بھی کی تھی۔

جامعات کے مستحق طلبہ کی اعانت

کالجوں اور جامعات میں زیر تعلیم مستحق طلبہ کی اعانت کی جاسکتی ہے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ انہیں زکوٰۃ کی مدد سے براہ راست رقم دی جائے اور وہ متعلقہ ادارے کی فیس خود ادا کریں۔ انہیں ذاتی استعمال کے لئے بطور ملکیت کتابیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ البتہ زکوٰۃ کی رقم سے لیبارٹری کے آلات، کمپیوٹرز، لائبریری کے لئے کتب نہیں خریدی جاسکتیں کیونکہ زکوٰۃ محض کسی چیز کو مباح قرار دینے یا اس پر تصرف

کا موقع دینے سے ادا نہیں ہوتی۔ البتہ جس طالب علم کی اعانت مالِ زکوٰۃ سے کی گئی ہو اس سے ان اشیاء یا لائبریری، لیبارٹری، ہاسٹل وغیرہ کے استعمال کی فیس وصول کی جاسکتی ہے۔

محض رقم الگ کر دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی

محض اپنے پاس سے زکوٰۃ کی نیت سے رقم الگ کر کے رکھ لینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی تاوقتیکہ وہ مستحقین تک پہنچانہ دی جائے، لہذا اگر زکوٰۃ کی نیت سے رقم اپنے پاس الگ کر کے رکھ دی ہو اور خدا نخواستہ وہ تلف ہو جائے یا چوری ہو جائے تو زکوٰۃ اب بھی ادا کرنا لازم ہے، اس طرح وہ بری الذمہ نہیں ہوگا۔

دورانِ سال زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی

اگر دورانِ سال کوئی صاحبِ نصاب تھوڑی تھوڑی رقم وقتاً فوقتاً زکوٰۃ کی نیت سے مستحقین کو ادا کرتا رہا ہے تو سال کے اختتام پر، تخصیص زکوٰۃ کے بعد پہلے سے ادا شدہ رقم کو وضع کر کے باقی رقم ادا کرے، اسی طرح مجموعی واجب الادا زکوٰۃ کی رقم بالاقساط بھی ادا کر سکتا ہے۔

زکوٰۃ فنڈ سے قرض حسن

حال ہی میں ہمارے پاس ایک سے زیادہ استفسار آئے ہیں کہ بعض برادریوں (Communities) کی فلاحی انجمنیں (Welfare Associations) ہیں، وہ برادریوں کے اہل ثروت افراد سے زکوٰۃ، فطرہ اور فدیہ کی رقم جمع کر کے اس میں سے برادری کے نادار اور مستحق افراد کی مدد کرتے ہیں، یہ ایک مستحسن امر ہے اور شرعاً درست ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کرتے ہیں کہ اس زکوٰۃ فنڈ سے ضرورت مند افراد کو قرض حسن کے طور دیتے ہیں اور پھر ان سے آسان اقساط میں وصول کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا جاری (Regenerating) فنڈ بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اس طرح زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، زکوٰۃ کی ادائیگی سے بری الذمہ ہونے کی صورت یہ ہے کہ مستحق زکوٰۃ کو اس کا مالک بنادیں اور ان کو اختیار ہو کہ اپنی آزادانہ مرضی سے جیسے چاہیں تصرف کریں، انجمنوں (Associations) کے ذمہ داران صرف زکوٰۃ کے لئے اہل ثروت کے وکیل ہوتے ہیں اور اگر وہ اس ذمہ داری کو شرعی احکام کے مطابق ادا نہیں کریں گے تو عند اللہ جواب دہ ہوں گے۔ ایسی انجمنوں کے ذمہ داروں کو چاہئے کہ وہ صدقات واجبہ (زکوٰۃ، فدیہ، فطرہ، نذر اور کفارہ کی رقوم) سے الگ عطیات اور نفلی صدقہ و خیرات پر مشتمل ایک رفاہی فنڈ (Welfare Fund) قائم کریں جس سے ضرورت مندوں کو بلا سود قرضے جاری کریں اور ادائیگی کے لئے انہیں حسبِ حال رعایت دیں اور اگر کوئی نادار قرض کی واپسی کے قابل نہ ہو تو اسے معاف کر دیں۔ یہ اپنی جگہ ایک بہت بڑی نیکی اور اجر کا کام ہے۔

زکوٰۃ فنڈ کا انویسٹمنٹ

بعض انجمنیں زکوٰۃ کی رقوم کو قومی بچت کی اسکیموں میں لگا کر سرمایہ کاری کرتی ہیں، اور ان سے جو سود حاصل ہوتا ہے اس سے ناداروں کی اعانت کرتی ہیں، یہ عمل بھی شرعاً ناجائز ہے، اس سے زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوتی اور سود لینے کا وبال الگ ہے، ایسے لوگ گنہگار ہیں، اگر زکوٰۃ دینے والوں کی منشا بھی اس میں شامل ہے تو وہ بھی گنہگار ہوں گے اور ان کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں ہوگی۔

اپنے اصول و فروع کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا

قرابت دار اگر صاحبِ نصاب نہ ہوں بلکہ مفلس و نادار ہوں تو ان کو زکوٰۃ دینا نہ صرف جائز ہے بلکہ افضل ہے۔ تاہم اپنے اصول (یعنی ماں باپ، دادا دادی، نانائانی وغیرہ) اور فروع (یعنی بیٹا بیٹی، پوتا پوتی، نواسا نواسی وغیرہ) کو زکوٰۃ دینے سے ادا نہیں ہوگی۔ یہی حکم صدقہ فطر، فدیہ، نذر اور کفارہ کی رقوم کا ہے، بہو یا داماد، سوتیلے باپ، سوتیلی ماں، دوسری ازواج سے شوہر کی اولاد یا شوہر کی اپنی بیوی کی کسی سابقہ شوہر کی اولاد کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے۔ البتہ بہن بھائی بشرطِ استحقاق ایک دوسرے کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

ہر فرد مسؤول ہے

اسلامی عبادات خواہ بدنی ہوں (جیسے نماز اور حج وغیرہ) یا مالی (جیسے زکوٰۃ، فطرہ، فدیہ وغیرہ) ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرداً فرداً عائد ہوتی ہیں۔ خاندان پر کثیثتِ مجموعی عائد نہیں ہوتی۔ لہذا والدین اور اولاد، شوہر اور بیوی میں سے جو بھی ”صاحبِ نصاب“ ہوگا، اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور اسے اپنے مال میں سے ادا کرنی ہوگی۔ ہاں البتہ اگر شوہر بیوی کی طرف سے یا اولاد والدین کی طرف سے ان کی مرضی اور اجازت سے زکوٰۃ ادا کریں تو ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ کی شرح اور حکمتِ زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرح سونا، چاندی، نقد رقوم، شیمیز، بینک ڈیپازٹس، بانڈز، اموالِ تجارت وغیرہ پر ڈھائی فیصد ہے، جو فرض کے درجے میں ہے، مطلوبِ کامل اور آئیڈیل نہیں ہے۔ آئیڈیل تو یہ ہے کہ انسان زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد باقی حلال اور طیب مال میں سے بھی ناداروں اور حاجت مندوں کی مدد کرے۔ ضرورت مند، قرابت داروں کی اعانت کرے۔ صدقاتِ نافلہ، عطیات اور صدقاتِ جاریہ کے کاموں میں صرف کرے، دولت کا بندہ بن کر نہ رہ جائے، دولت کو اللہ کی بندگی میں خرچ کرے۔

تنگی رزق بارِ قرض سے سبکدوش ہونے کا وظیفہ

سوال :

آج کل میں معاش اور روزگار کی تنگی کا شکار ہوں، قرض کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں اور ادائیگی کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی، کوئی ایسا وظیفہ بتائیے جس کی برکت سے بارِ قرض سے نجات مل جائے اور رزق میں کشادگی آئے۔ ﴿عبدالرحمن، کیمڑی، کراچی﴾

جواب :

امام احمد رضا قادری نے لکھا ہے کہ قرض اور تنگی رزق سے نجات کے لیے مندرجہ ذیل وظیفہ پڑھیں، ہر نماز کے بعد گیارہ مرتبہ اور صبح و شام سو سو بار، اول و آخر درود شریف پڑھیں، لکھتے ہیں: ”اس دعا کی نسبت حضرت علیؓ نے فرمایا: اگر تجھ پر مثل پہاڑ کے بھی قرض ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی ادائیگی کے اسباب پیدا فرمادے گا۔ دعا کے کلمات مبارکہ یہ ہیں۔

اللَّهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَ اغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ ۔

”اے اللہ! مجھے حلال رزق اس قدر عطا فرما کہ حرام کی حاجت ہی نہ رہے اور اپنے فضل و کرم سے اتنا عطا فرما کہ غیر کا احتیاج نہ

رہے۔“

اسی طرح آپ سے پوچھا گیا کہ آمدنی کی قلت ہے اور اہل و عیال کی کثرت سے سخت دشواری ہے، آپ نے فرمایا کہ بعد نمازِ عشاء قبلہ رو ہو کر با وضو، ننگے سر ایسی جگہ کہ جہاں سر اور آسمان کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، یہاں تک کہ سر پر ٹوپی بھی نہ ہو، روزانہ پانچ سو بار ”يَا مُسَبِّبَ الْأَسْبَابِ“ پڑھے اول و آخر گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے۔

(نوٹ: خواتین سر ڈھانپ کر ایسی جگہ بیٹھ کر پڑھیں جہاں پردے کا بھی اہتمام ہو) ان وظائف کے ساتھ حسبِ توفیق و استطاعت جدوجہد اور سعی و عمل میں بھی مشغول رہیں، انشاء اللہ العزیز مشکل سے نجات کی کوئی نہ کوئی سبیل ضرور مقدر ہوگی۔

شوہر مقروض ہو اور بیوی کے پاس سونا ہو

سوال :

میں بچوں کی شادی پر دولاکھ کا مقروض ہوں، میری بیوی کے پاس اگر مقدارِ نصاب یا اس سے زیادہ سونا ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کس کے ذمے ہے۔ ﴿شاہ نواز بخش۔ پی این ایس بہادر﴾

جواب :

شرعاً ہر عاقل و بالغ مسلمان مرد و عورت اپنے اپنے اعمال کے لئے جواب دہ ہیں، احکام شرعیہ میں خاندان بطور ایک یونٹ کے نہیں ہوتا بلکہ ہر ہر فرد اپنی اپنی ذات کے لئے مسئول ہوتا ہے۔ آپ مقروض ہیں تو آپ پر زکوٰۃ نہیں۔ آپ کی بیوی کے پاس بقدرِ نصاب، یعنی ساڑھے سات تولے (۸۷۷ گرام) یا اس سے زائد سونا موجود ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، اگر نقد رقم ادائیگی زکوٰۃ کے لئے نہیں ہے تو اسی سونے کا چالیسواں یعنی (۲۱/۲) ڈھائی فیصد وزن کاٹ کر دے۔

زکوٰۃ کا نصاب**سوال :**

سونے کے لئے زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے؟ ﴿غازی خان شارع فیصل۔ ہلال احمد۔ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی﴾

جواب :

سونے کیلئے زکوٰۃ کا نصاب ساڑھے سات تولے یعنی ۸۷۷ گرام ہے، بشرطیکہ صرف سونا ہو اور کوئی دوسرا مال چاندی یا نقد رقم یا مال تجارت ملکیت میں نہ ہو، اگر اموال متفرق ہوں تو پھر چاندی کا نصاب معتبر ہوگا۔ یعنی ساڑھے باون تولے یا ۶۱۲۳ گرام چاندی یا اس کی رائج الوقت بازاری قیمت۔

زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر دی جائے**سوال :**

زکوٰۃ بینک کے منافع یا اصل رقم پر ادا کی جائے، حکومتی بچت اسکیموں میں جمع رقم کا منافع ششماہی ملتا ہے، زکوٰۃ کیسے ادا ہوگی؟ اگر اصل رقم پر ہی گزراوقات ہے تو کیا پھر بھی اس پر زکوٰۃ ہے، متفرق مال پر کس طرح زکوٰۃ دی جائے، کاروباری منافع پر بھی زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ ﴿ہلال احمد۔ سوسائٹی﴾

جواب :

بینک یا حکومت کی بچت اسکیموں میں جمع اصل رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، بینک انٹرسٹ تو سود ہے، جو شرعاً حرام ہے اور زکوٰۃ تو طیب مال پر واجب ہے، کاروباری منافع جائز ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب ہے، تاریخ تشخیص زکوٰۃ پر مختلف مدات میں جتنا بھی مال ہو، مثلاً تنخواہ کی آمدنی (اگر ہے)، کرائے کی آمدنی (اگر ہے)، مال تجارت (اگر ہے)، بینک یا اسکیموں میں جمع شدہ اصل رقم، کاروبار میں لگا ہوا مال مع

منافع، کسی پر قرض ہے تو، اور زیورات وغیرہ، الغرض تمام ذرائع سے جو مال سال کے آخر میں بچ جاتا ہے اور جمع رہتا ہے، اس سب پر زکوٰۃ ہے ڈھائی فیصد کی شرح سے۔ کل مالیت کو چالیس پر تقسیم کر دیں زکوٰۃ نکل آئے گی۔ بیٹی کی زکوٰۃ کی رقم سے انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرنا۔

سوال :

میری بیٹی انگلینڈ میں رہتی ہے، وہ زکوٰۃ کی رقم بھیجتی ہے، جسے میں اپنے نام سے جمع کر دیتا ہوں، پھر زکوٰۃ دے کر اپنے نام سے رسید بنوا لیتا ہوں اور اس کی بناء پر انکم ٹیکس میں چھوٹ حاصل کرتا ہوں، کیا یہ شرعاً درست ہے؟ ﴿زاهد عثمانی۔ ناظم آباد﴾

جواب :

آپ کی بیٹی کا آپ کو ادائیگی زکوٰۃ کے لئے وکیل بنانا درست ہے۔ لیکن آپ کا اس رقم زکوٰۃ کو اپنی زکوٰۃ دکھا کر اس کے ذریعے انکم ٹیکس سے REBATE یعنی چھوٹ لینا درست نہیں ہے، یہ غلط بیانی ہے اور اسلام میں جائز نہیں ہے، کیونکہ اس REBATE کا استحقاق آپ کو تب حاصل ہوتا ہے جب آپ نے اپنی زکوٰۃ ادا کی ہو نہ کہ کسی اور کی، خواہ بیٹی ہی کیوں نہ ہو۔

بنو ہاشم کے لئے بنو ہاشم کی زکوٰۃ

سوال :

ہمارا تعلق بنو ہاشم سے ہے یعنی ہم حضرت عباس بن عبدالمطلب کی اولاد ہیں، کیا ہم اپنی زکوٰۃ اپنے نادار رشتہ داروں کو دے سکتے ہیں؟ ﴿نیاز الدین عباسی، گلشن اقبال﴾

جواب :

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ”ہمارے لئے صدقہ جائز نہیں ہے“۔ ائمہ اربعہ کے نزدیک بنو ہاشم کیلئے زکوٰۃ جائز نہیں ہے۔ بنو ہاشم میں آل علی، آل عباس، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث بن عبدالمطلب شامل ہیں۔ بنو ہاشم کی اپنی زکوٰۃ بھی بنو ہاشم کے لئے جائز نہیں ہے۔ تاہم جو سادات یا بنی ہاشم ضرورت مند ہوں بنو ہاشم اور غیر بنو ہاشم سب کو چاہئے کہ اعزاز و اکرام کے ساتھ ان کو ہدیہ اور نفلی صدقہ دیں اور رسول اللہ ﷺ سے نسبی قرابت کی وجہ سے ان کا احترام کریں اور حب رسول کا ثبوت دیں۔

سید کی غیر سیدہ بیوی کو زکوٰۃ دینا

سوال:

اگر شوہر سید ہو اور اس کی بیوی غیر سیدہ، تو کیا بیوی کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ ﴿نسیم عبداللہ۔ ڈیفنس﴾

جواب:

جی ہاں دی جاسکتی ہے، اس کے بعد وہ اس مال کی مالک ہے جیسے چاہے خرچ کرے۔

بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ

سوال:

بیوی اور بہو کے سونے کی زکوٰۃ ایک ساتھ ادا کی جاسکتی ہے؟ ﴿محمد نواز۔ بزنس ایونیو﴾

جواب:

شرعاً ہر عاقل و بالغ مرد و عورت اپنے اپنے دینی فرائض (مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ) کے لئے جوابدہ ہے۔ بیوی شوہر کو اور بہو سر کو اپنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے وکیل بنا سکتی ہیں، یا وہ خود ان کی اجازت سے ادا کر سکتے ہیں۔

بہن کو زکوٰۃ دینا

سوال:

میری بہن کے شوہر معذور ہیں، ان کا ذاتی مکان بھی نہیں ہے، تو کیا انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے؟ ﴿نوید احمد۔ ناظم آباد﴾

جواب:

اگر شرعاً بہن یا بہنوئی مستحق زکوٰۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہوں تو انہیں زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔

کیا دو سال کی زکوٰۃ اکٹھی دی جاسکتی ہے

سوال:

کیا دو سالوں کی زکوٰۃ اکٹھی کر کے ایک صاحب کو دی جاسکتی ہے؟ ﴿نوید احمد، ناظم آباد﴾

جواب:

دینی فریضے کا بروقت ادا کرنا افضل ہے، تاہم اگر گزشتہ سال کی زکوٰۃ کسی کے ذمے باقی ہے تو اسے رواں سال کی زکوٰۃ کے ساتھ ملا کر دیا جاسکتا ہے، کسی ایک فرد کو زکوٰۃ کی بڑی رقم دینا اگرچہ مستحسن نہیں ہے لیکن دینے سے ادا ہو جائے گی۔

صدقات کے فنڈ سے قرض حسن

سوال:

پاکستان بھر میں ایک برادری جو اپنی برادری کے غریب، نادار، بے سہارا، بیوہ، یتیم اور بیماروں کی فلاح و بہبود کیلئے برادری کے مخیر حضرات سے زکوٰۃ، خیرات، صدقات، قربانی کی کھالیں و نقد عطیات وصول کرتی ہے اور شعبہ امداد کے ذریعے برادری کے لوگوں کی مالی مدد کرتی ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں واضح کریں کہ اس فنڈ (شعبہ امداد) سے برادری کے کسی شخص کو قرض حسن دیا جاسکتا ہے تاکہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر کے اپنی آمدنی بڑھا سکے اور اپنے خاندان کی کفالت آسانی سے کر سکے اور ماہانہ ادائیگی کرتا رہے۔

﴿محمد یاسین ملک، کراچی﴾

جواب:

صدقات کی دو قسمیں ہیں، ایک صدقات واجبہ ہیں، جیسے زکوٰۃ، فطرہ، نذر، کفارات اور فدیہ کی رقوم، ان کے آٹھ مصارف اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ آیت نمبر ۶۰ میں متعین کر کے بتا دیے ہیں، لہذا یہ رقوم مالکانہ بنیاد پر ان مستحقین کو دے دی جائیں اگر برادری کے اندر ایسے مستحقین موجود ہوں تو انہیں دیں، ورنہ صدقات دینے والوں کی اجازت سے برادری سے باہر کے ضرورتمندوں اور ناداروں کی مدد کریں، ان صدقات واجبہ کا کھاتہ (Head of Account) اور مصارف کا ریکارڈ الگ ہونا چاہئے۔ دوسری قسم کے صدقات نفلی ہیں جن میں عام خیرات کی رقم اور عطیات شامل ہیں، ان میں سے ”قرض حسنہ“ کا شعبہ قائم کر سکتے ہیں، بشرطیکہ عطیہ و خیرات دینے والے اس کی اجازت دیں۔

زیورات پر زکوٰۃ جبکہ نقد رقم نہ ہو

سوال :

ہماری مالی حیثیت کمزور ہے، ہم پر زیورات کی ڈھائی ہزار روپے زکوٰۃ واجب الادا ہوتی ہے، جو ہم سال بھر تھوڑا تھوڑا کر کے بھی بمشکل ادا کر پاتے ہیں کہ نئے سال کی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے۔ اب بتائیں کہ اس حال میں ہمارا مال اور کھانا پینا حرام ہے؟ نیز یہ کہ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

﴿م۔ الف۔ ع، کراچی﴾

جواب :

سونا یا چاندی زیورات کی شکل یا کسی بھی شکل میں اگر بقدر نصاب ہے تو اس پر زکوٰۃ بہر حال فرض ہے۔ آپ نے جو صورت بیان کی ہے، اس کی رو سے آپ زکوٰۃ ادا کر رہے ہیں، اگرچہ اقساط میں اور قدرے تاخیر سے، زکوٰۃ کی ادائیگی میں شریعت نے یہ رخصت رکھی ہے کہ وقت سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ اقساط میں بھی ادا کی جاسکتی ہے اور یکمشت بھی ادا کی جاسکتی ہے، بروقت ادا کرنا افضل ہے کیونکہ کسی کو نہیں معلوم کہ کل کا دن زندگی میں آئے گا یا نہیں آئے گا۔ تاہم وقت وجوب کے بعد کی ادا کردہ زکوٰۃ بھی عند اللہ ادا ہی شمار ہوتی ہے۔ زکوٰۃ میں قضاء کا تصور نہیں ہے۔ لہذا آپ کا مال اور کھانا پینا حلال ہے، متفکر نہ ہوں اور اللہ تعالیٰ سے رزق کی کشادگی اور وسعت کے لئے دعاء کرتے رہیں اور مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد ادا دل و آخرد و دشریف پڑھ کر یہ دعاء قرآنی پڑھیں:

وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۖ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ ﴿الطلاق: ۲، ۳﴾

اور جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے مشکل اور تنگی سے نکلنے کی راہ نجات مقدر فرما دیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق عطا فرما دیتا ہے جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتی۔“ اور سوبار ”يَا مُسَبِّبَ الْأَسْبَابِ“ پڑھا کریں۔

سونا اور چاندی جب کم از کم مقدار نصاب کی مالیت کی ہیں ان پر زکوٰۃ فرض ہے اگر نقد رقم نہیں تو اس میں سے چالیسواں حصہ نکال کر دینا ہوگا۔ باقی شریعت نے زکوٰۃ ”مال نامی“ پر فرض کی ہے، یعنی ایسا مال جس میں اگر انسان کاروبار وغیرہ کے ذریعے چاہے تو نمو کی صلاحیت موجود ہے ورنہ خانہ داری کے سامان، سواری کی چیز یا آلات کسب پر زکوٰۃ نہیں ہے نہ ہی مکان کی مالیت پر زکوٰۃ ہے۔

اگر عید الفطر کے دن صدقہء فطر نہ ادا کر سکا ہو تو؟

سوال :

میری آمدنی بہت کم ہے اور گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرم کو میرے پاس ضرورت سے زائد اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ میں اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا فطرہ ادا کر سکتا، کیا اب مجھ پر اس کی قضاء واجب ہے اور مجھے بعد میں ادا کرنا ضروری ہے۔ ﴿عبداللہ۔ لائڈھی، کراچی﴾

جواب :

یکم شوال المکرم یعنی عید الفطر کو، جن صاحب کی ملک میں ضرورت سے زائد بقدر نصاب زکوٰۃ فاضل رقم موجود ہو، ان پر اپنے اور اپنے زیر کفالت افراد کا فطرہ ادا کرنا واجب ہے۔ فطرے کے وجوب کے لئے نصاب پر سال گزرنا یا سال بھر ”صاحب نصاب“ رہنا شرط نہیں ہے، یہی صورت حال قربانی کے وجوب کی ہے، جبکہ اس کے برعکس ”فرضیت زکوٰۃ“ کے لئے سال بھر ”صاحب نصاب“ رہنا شرط ہے۔ اگر آپ کے پاس عید الفطر کے دن یعنی یکم شوال المکرم کو وقتی ضرورت سے زائد کم از کم نصاب زکوٰۃ کے برابر رقم نہیں تھی، تو آپ پر صدقہء فطر واجب ہی نہیں ہوا، لہذا اس کی کوئی قضاء بھی آپ کے ذمے نہیں ہے۔ البتہ اگر آپ اس دن ”صاحب نصاب“ ہوتے اور فطرہ ادا نہ کیا ہوتا تو جب تک آپ ادا نہ کرتے آپ سے اس کا وجوب ساقط نہ ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دین میں آسانی رکھی ہے اور بندے کو کسی ایسی جسمانی یا مالی ذمہ داری کے لئے مکلف (جوابدہ) نہیں ٹھہرایا، جس کا ادا کرنا اس کے بس میں نہ ہو۔

﴿کتاب الصوم﴾

تراویح کی رکعات کتنی ہیں؟

سوال :

تراویح کی رکعات آٹھ ہیں یا بیس، دلائل سے بتائیں۔؟ ﴿مہر۔ بلوچ کالونی﴾

جواب :

جہاں تک آٹھ رکعات کا حضور ﷺ سے بطور تراویح ثابت کرنے کا دعویٰ ہے، یہ باطل ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں حدیث ہے: ”اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز (تہجد) رمضان وغیر رمضان میں تیرہ رکعات ہوتی تھیں۔“

اس سے معلوم ہوا کہ گیارہ، تیرہ اور پندرہ رکعات مع وتر کے بارے میں جو احادیث ہیں وہ تہجد پر محمول ہیں، جو رمضان وغیر رمضان دونوں کے بارے میں ہیں، ان سے تراویح کا ثبوت درست نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس بات پر اجماع ہے کہ تراویح کی رکعات کی تعداد بیس ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ اور مؤطا امام مالک کی روایات میں مع وتر ۲۳ رکعات کا ثبوت موجود ہے، اسی طرح سنن کبریٰ للبیہقی، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ میں متعدد روایات ۲۰ تراویح کے ثبوت میں موجود ہیں۔ حافظ ابوبکر کی السنن الکبریٰ اور سنن ترمذی میں بھی ۲۰ رکعات تراویح کا ثبوت موجود ہے۔

کیا تراویح بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہیں

سوال :

کیا نماز تراویح بیٹھ کر پڑھی جاسکتی ہے؟ ﴿مسز سرور مظہر۔ ڈیفنس فیئر II﴾

جواب :

جی ہاں پڑھی جاسکتی ہے، لیکن کھڑے ہو کر پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے، البتہ اگر کسی عذر کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھی جائے تو ثواب میں کمی نہیں ہوگی۔

چار چار رکعات کی نیت کے ساتھ 'تراویح' پڑھنا

سوال:

کیا تراویح کی نماز دو دو رکعت پڑھنے کے بجائے ایک نیت کے ساتھ چار چار رکعات کر کے پڑھی جاسکتی ہیں۔

﴿نسیم عبداللہ۔ ڈیفنس﴾

جواب:

جی ہاں، پڑھی جاسکتی ہیں، البتہ دو گانہ کر کے پڑھنے کا ثواب زیادہ ہے۔

پانچ روزہ تراویح

سوال:

آج کل یہ عام رواج ہے کہ لوگ پانچ روزہ، چھ روزہ اور دس روزہ تراویح و ختم قرآن کا اہتمام کرتے ہیں، کیا یہ طریقہ درست ہے۔ ﴿محمد شریف، گلشن اقبال، حمید قریشی۔ گلشن اقبال﴾

جواب:

اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ بیرون مسجد، پارکس، مکانات وغیرہ میں جو جماعت کا اہتمام ہوتا ہے، اس میں نماز باجماعت تو یقیناً ادا ہوگی لیکن مسجد کا ثواب نہیں ملے گا۔ اگر پانچ روزہ یا دس روزہ تراویح و ختم قرآن سے لوگ یہ سمجھ لیں کہ بس ایک قرآن ختم ہو گیا، اب تراویح سے بھی فارغ، تو یہ طرز عمل اور سوچ بالکل غلط ہے، تراویح پورے ماہ رمضان کی سنت ہے، لہذا جن لوگوں کا ختم قرآن ستائیسویں کو ہوتا ہے، ان کو بھی چاہئے کہ بقیہ دنوں کی تراویح باقاعدگی سے پڑھیں۔

روزے کی حالت میں سر پر مہندی اور خوشبو لگانا

سوال:

کیا روزے کے دوران سر پر تیل، مہندی یا خوشبو لگانا جائز ہے؟ ﴿شازیہ۔ جمشید روڈ﴾

جواب :

جی ہاں لگا سکتے ہیں، اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

مسنون دعاء افطار کب پڑھی جائے؟

سوال :

عام طور پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ افطار کے وقت پہلے مسنون دعاء افطار پڑھتے ہیں، پھر افطار کرتے ہیں، جبکہ کھانے کی دعاء کھانے کے بعد پڑھی جاتی ہے، ازراہ کرم بتائیے کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟

﴿محمد ناصر خان چشتی۔ گلشن اقبال..... محمد اعظم۔ مظفر آباد، آزاد کشمیر﴾

جواب :

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب روزہ کھول لیتے تو فرماتے: پیاس چلی گئی، رگیں تر ہو گئیں، اور انشاء اللہ اجر ثابت ہو گیا ہے۔“ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد﴾

دوسری حدیث میں ہے: معاذ بن زہرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ جب افطار فرما لیتے تو یہ دعاء پڑھتے:

اللَّهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلَى رِزْقِكَ أَفْطَرْتُ۔ ﴿مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد﴾

”اے اللہ! میں نے تیری رضا کے لئے روزہ رکھا اور تیرے ہی عطا کردہ پر افطار کیا۔“

حدیث مبارک کے الفاظ بالکل واضح ہیں کہ افطار سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ اظہارِ بندگی اور تشکرِ نعمت باری تعالیٰ کے لئے یہ دعاء فرماتے۔ امام احمد رضا خان قادری فتاویٰ رضویہ میں لکھتے ہیں کہ ملا علی القاری شارح مشکوٰۃ نے بھی یہی لکھا کہ حضور ﷺ افطار کے بعد یہ دعاء مانگتے تھے، اور ابن المبارک نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ ”أَيُّ قَرَأَ بَعْدَ الْإِفْطَارِ“ یعنی آپ افطار کے بعد یہ دعاء پڑھتے تھے۔ اور اگر کوئی شخص اس دعاء کو ”قبل افطار“ پر محمول کرتا ہے تو وہ بلا ضرورت حدیث میں تاویل کرتا ہے، یعنی اس صورت میں کلمات حدیث ”إِذَا أَفْطَرْتُ“ کے معنی یہ کرنا پڑیں گے کہ ”أَيُّ إِذَا أَرَادَ الْإِفْطَارَ“ یعنی جب آپ افطار کا ارادہ فرماتے، اور بلا ضرورت حدیث پاک میں اپنی من پسند تاویل کرنا درست نہیں ہے۔

کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے؟

سوال :

کیا دس سالہ بچی پر روزہ فرض ہے؟ ﴿فائزہ۔ گلشن اقبال﴾

جواب :

جی نہیں، دس سالہ بچی پر روزہ فرض نہیں ہے، البتہ وہ شوق سے نفلی روزہ رکھ سکتی ہے۔ فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر علاماتِ بلوغ ظاہر ہو جائیں تو اس پر بلوغت کا حکم لگایا جائے گا اور اس پر احکامِ شرعیہ فرض ہو جائیں گے، اور کم از کم نو سال کی عمر میں بلوغت ممکن ہے، اگر علامات ظاہر نہ ہوں تو پندرہ سال پورے ہونے پر بالغ تصور کیا جائے گا۔

ڈاکٹر کا ٹیوبلائزیشن کے ذریعے بچوں کی ولادت کا آپریشن کرنا

سوال :

میں ڈاکٹر ہوں، ٹیوبلائزیشن کے ذریعے ہمیں ڈیلیوری کرانا پڑتی ہے، ستر کھلتا ہے، کیا ایسے آپریشن سے میرے روزے پر اثر پڑے گا، طبی عمل کے ذریعے بچوں کی تولید بند کرنا شرعاً کیسا ہے؟ ﴿عائشہ دانش۔ کارساز﴾

جواب :

یہ اطمینان کی بات ہے کہ خواتین کے علاج اور آپریشن کے لئے خواتین ڈاکٹر موجود ہیں، نفسانی حظ و شہوت کے لئے ستر کو دیکھنا اور چھونا حرام ہے، علاج کے لئے جائز ہے اور اس سے ڈاکٹر کے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا بلکہ یہ انسانیت کی خدمت ہے۔ جب فطری طریقے سے کسی حاملہ خاتون کے ہاں زچگی نہ ہو سکتی ہو یا زچہ و بچہ کے لئے اس میں خطرہ ہو تو ٹیوبلائزیشن کے ذریعے ڈیلیوری کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی خداترس مسلمان ڈاکٹر یہ کہے کہ مزید بچے پیدا ہونے سے عورت کی صحت یا زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے تو مصنوعی طریقے سے عمل تولید کی بندش جائز ہے اور شوہر کی رضا مندی ہو تو بہر صورت جائز ہے۔

روزے کی حالت میں اگر بتی سلگانا

سوال :

﴿محمدناصر خان چشتی..... گلشن اقبال، کراچی﴾ کیا روزے دار جہاں بیٹھے ہوں، وہاں اگر بتی سلگانا جائز ہے؟

جواب :

جائز ہے، لیکن اگر بتی سلگا کر اسے دانستہ ناک کے قریب لے جا کر اس کا دھواں ناک کے اندر کھینچے تو دھواں اندر جانے کی صورت میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور قضا لازم آئے گی۔

روزے میں INHALER کا استعمال

سوال :

﴿فائزہ۔ گلشن اقبال﴾ کیا روزے میں INHALER کا استعمال جائز ہے اور اس سے روزے پر اثر پڑے گا یا نہیں؟

جواب :

ڈاکٹر صاحبان سے ہم نے اس سلسلے میں جو معلومات حاصل کی ہیں، ان کے مطابق سانس کے مریض کے پھیپھڑے سکڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں سانس لینے میں تکلیف اور دشواری محسوس ہوتی ہے۔ انہیلر کے ذریعے ایسے کیمیکلز گیس یا مائع بوندوں کی شکل میں ان کے پھیپھڑوں میں پہنچتے ہیں جن کی بناء پر ان کے پھیپھڑے (LUNGS) کھل جاتے ہیں اور وہ دوبارہ آسانی سے سانس لینے لگتا ہے، تو چونکہ مریض کے بدن کے اندر ایک مادی چیز جاتی ہے لہذا اس کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے، اور اگر مرض اس درجے کا ہے کہ پورے روزے کا وقت انہیلر کے استعمال کے بغیر مریض کے لئے گزارنا مشکل ہے تو پھر وہ معذور ہے، بر بنائے عذر و بیماری روزہ نہ رکھے اور فدیہ ادا کرے۔

روزے کی حالت میں آنکھ میں سرمہ لگانا یا دوا کے ڈراپ ڈالنا

سوال :

روزے کی حالت میں کیا سرمہ لگا سکتے ہیں، یا آنکھ میں دوا کے قطرے ڈالے جاسکتے ہیں، اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا یا نہیں؟

﴿طارق۔ لائڈھی﴾

جواب :

روزے کی حالت میں سرمہ لگانے کی اجازت تو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اور اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دوا کے قطرے ڈالنے کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں اور یہ اختلاف آراء اس بات پر مبنی ہے کہ آنکھ سے حلق کی طرف کوئی نالی یا سوراخ ہے یا نہیں۔ جدید طبی تحقیق یہ ہے کہ آنکھ سے حلق کی طرف نالی (ROUTE) ہے، لہذا ہم اس رائے سے متفق ہیں کہ آنکھ میں دوا کے قطرے ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔

روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا

سوال :

روزے کی حالت میں لپ اسٹک لگانا کیسا ہے، کیا اس کے ذرات پیٹ میں جانے سے روزہ ٹوٹ جائے گا؟

﴿کمال اشرف۔ کلفٹن﴾

جواب :

ویسے تو لپ اسٹک مفسدِ صوم نہیں ہے، لیکن اگر ہونٹوں پر زبان پھیرنے کی عادت ہے اور اس سے لپ اسٹک کے ذرات پیٹ میں چلے جاتے ہیں تو روزہ ٹوٹ جائے گا، لہذا احتیاط بہتر ہے۔

معتکف خاتون کا اپنے لئے کھانا خود تیار کرنا؟

سوال :

میں تنہا خاتون اپنے گھر میں رہتی ہوں، گھر پر میری خدمت کیلئے اور کوئی بھی نہیں ہے، میں چاہتی ہوں کہ اپنے گھر میں اعتکاف پر بیٹھ جاؤں، اور کسی رشتے دار کو تکلیف دینے کے بجائے اپنا کھانا خود تیار کر لوں، کیا اس طرح میرا اعتکاف ہو جائے گا؟

﴿آفرین فاطمہ۔ گلشن اقبال﴾

جواب :

آپ اس طرح اعتکاف پر بیٹھ سکتی ہیں، اپنے گھر پر ایک جگہ متعین کر کے، صرف کھانا پکانے کے لئے ضرورتاً کچن میں جائیں اور کھانا اٹھا کر اپنی جائے اعتکاف پر لا کر کھائیں اور باقی معمولات میں احکامِ اعتکاف کی پابندی کریں۔

روزے میں سحری کے بعد اگر غسل واجب ہو جائے تو روزہ رہے گا؟

سوال :

رمضان المبارک میں سحری کے بعد روزے کی حالت میں احتلام ہو گیا اور غسل واجب ہو گیا، تو کیا روزہ قائم رہے گا؟
﴿مستقیم، پی ای سی ایچ الیس۔ کراچی﴾

جواب :

جی ہاں روزہ بدستور قائم رہے گا، جتنی جلد ہو سکے غسل واجب ادا کر کے پاک ہو جائیں تاکہ کسی وقت کی نماز قضا نہ ہو جائے۔

بیوی ”بائی پاس آپریشن“ کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتی

سوال :

بیوی کا ”بائی پاس آپریشن“ ہوا ہے، جس کی بناء پر روزہ نہیں رکھ سکتی، کتنا ذیہ ہوگا۔ ﴿حفیظ الرحمن۔ سوسائٹی﴾

جواب :

اگر بیوی کا ”بائی پاس“ آپریشن ہوا ہے اور کوئی خداترس دین دار ڈاکٹر یہ مشورہ دیتا ہے کہ روزہ رکھنے سے مریض کا مرض بڑھنے کا اندیشہ ہے تو روزہ چھوڑ دیں اور فدیہ دیں، ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلانا ہے، یا اس کے مساوی نقد رقم دے دیں، کم از کم تیس (30) روپے یومیہ کے حساب سے۔

سحری میں اذان شروع ہونے کے بعد کھانا اور پینا

سوال :

سحری کے وقت اگر آنکھ دیر سے کھلے اور جب انسان اٹھے تو اذان ہو رہی ہو تو کیا اس وقت جلدی جلدی کچھ کھاپی سکتے ہیں، اس سے روزے پر اثر پڑے گا یا نہیں؟ ﴿ثریا پروین۔ نارتھ ناظم آباد، مسز سلیم۔ گلشن اقبال﴾

جواب :

روزہ، ایک محدود وقت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عبادت کی نیت سے، کھانے، پینے اور جنسی عمل سے رک جانے کا نام ہے۔ لہذا جوں ہی صبح صادق شروع ہوئی، جس کا وقت انتہائے سحر کے عنوان سے آج کل ریڈیو، ٹیلی وژن، مختلف اداروں کے مطبوعہ نقشہ جات،

اخبارات اور مساجد سے مشتہر ہو جاتا ہے، اور اذان فجر سحری کا وقت ختم ہونے پر ہی شروع ہوتی ہے۔ لہذا اس وقت کھانا پینا منع ہے اور اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس کی قضا لازم ہوگی۔ آپ سحری ختم ہونے کے چند منٹ بعد کھائیں یا چند گھنٹے بعد، آپ نے شریعت کی بندش کو توڑ دیا تو روزہ نہ رہا۔ ایسی صورت میں بغیر کچھ کھائے پیے روزے کی نیت کر لیا کریں۔

کوئی شخص دوسرے ملک سے رمضان کے روزے رکھ کر آئے تو اب تکمیل کس حساب سے کرے

سوال :

کوئی شخص مثلاً سعودی عرب سے روزہ رکھ کر آئے، جہاں رمضان المبارک ایک دن پہلے شروع ہوا تھا، وہاں کے حساب سے رمضان کے ایام ختم ہو گئے ہیں، لیکن یہاں پاکستان میں رمضان کا آخری دن چل رہا ہے، تو اب وہ کیا کرے، جہاں اور جس ملک میں رمضان المبارک شروع کیا تھا، اس کے حساب کے مطابق رمضان کی تکمیل کرے یا جہاں اب پہنچا ہے، اس کے حساب سے رمضان کی تکمیل کرے؟ ﴿مولانا غلام دستگیر افغانی..... آگرہ تاج کالونی﴾

جواب :

اس سلسلے میں ہمارے سامنے دو نصوص حدیث ہیں، ایک یہ کہ ”الصَّوْمُ يَوْمَ يَصُومُونَ وَالْفِطْرُ يَوْمَ يُفْطَرُونَ“، یعنی تم جس مقام پر ہو اس کے مطابق روزہ رکھو یا عید مناؤ، یعنی ان کی پیروی کرو، لہذا اگر تمہارے تیس روزے پورے بھی ہو گئے ہیں، تب بھی اس مقام والوں کا ساتھ دو، اس مقام کی اتباع میں آپ کے لئے ابھی رمضان جاری ہے۔

دوسرا یہ ماہ رمضان زیادہ سے زیادہ تیس دن کا ہوتا ہے، اگر آپ کے تیس روزے پورے ہو گئے ہیں تو آپ یہاں اب 31 واں دن کا روزہ نہ رکھیں، جبکہ ”فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ“..... ”پس تم میں سے جو اس ماہ رمضان کو پائے تو اس پر لازم ہے کہ اس کے روزے رکھے“ والی آیت قرآنی کی رو سے آپ اس مقام پر رمضان کو پار ہے تھے، لہذا آپ پر لازم ہے کہ روزہ رکھیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ آپ کے لئے یہ رمضان 31 دن کا متحقق ہوگا، آپ کے مخصوص حالات کی بناء پر۔

اور اگر آپ یہاں سے روزہ رمضان کا آغاز کر کے سعودی عرب جائیں اور وہاں بالفرض 29 ویں رمضان کو چاند نظر آئے گا، جبکہ آپ کے ابھی اٹھائیس روزے ہوئے کیونکہ پاکستان میں رمضان ایک دن پیچھے شروع ہوا تھا، تو اب کے پاس دو راستے ہیں ”الصَّوْمُ يَوْمَ يَصُومُونَ وَالْفِطْرُ يَوْمَ يُفْطَرُونَ“ پر عمل کرتے ہوئے روزہ نہ رکھیں اور بعد میں ایک دن کی قضا رکھیں، کیونکہ رمضان المبارک 29 دن سے کم کا نہیں ہوتا۔ یا ”اَكْمِلُوا الْعِدَّةَ“ پر عمل کرتے ہوئے ان کے ساتھ عید نہ منائیں اور اپنے روزے مکمل کر لیں۔

رمضان المبارک کی ستائیسویں شب کو بعد نماز تراویح مخصوص سورتیں پڑھنا

سوال:

ہمارے علاقے میں گاؤں کی مساجد میں بعض جگہ رمضان المبارک میں نماز تراویح میں ختم قرآن ہوتا ہے اور بعض جگہ چھوٹی سورتیں پڑھی جاتی ہیں لیکن ستائیسویں شب کو تعین کے ساتھ نماز تراویح کے بعد سورہ روم اور سورہ عنکبوت پڑھی جاتی ہے، کیا یہ درست ہے؟ ﴿سید ذاکر شاہ۔ بگرام، ہزارہ﴾

جواب:

کسی عمل خیر کو کسی خاص وقت، دن اور تاریخ کے ساتھ اس نظریے کے ساتھ متعین کر کے ادا کرنا کہ اس کا اجر و ثواب اس تعین کے ساتھ مشروط ہے یا یہ تعین اجر زائد کا سبب ہے اسے تعین شرعی کہتے ہیں، اور دلیل شرعی کے بغیر ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ شارع کا منصب ہے جیسے فرضی روزوں کے لئے رمضان المبارک کا تعین، قربانی کے لئے ۱۰ تا ۱۲ ذوالحجہ، حج کے لئے وقوف عرفہ اور ۹ ذوالحجہ، رمی جمرات کے لئے ۱۰ تا ۱۳ ذوالحجہ وغیرہ۔ بعض مواقع کے لئے بعض سورتوں کا تذکرہ احادیث مبارکہ میں آتا ہے مثلاً:

(۱) رسول اللہ ﷺ رات کو سونے سے پہلے ”الم تنزیل“ اور ”تبارک الذی بیدہ الملك“ پڑھا کرتے تھے۔

(۲) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہر رات کو سورۃ الواقعہ پڑھتا رہے وہ کبھی فقر و فاقہ اور تنگدستی کا شکار نہیں ہوگا۔

(۳) نبی اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص جمعہ کے دن ”سورۃ الکہف“ پڑھے دو جمعوں کے درمیان (مدت کے برابر) اس کے لئے وسیلہ نور ہوگی (یہ نور اس کے قلب کو روشن کرے گا یا اس کی قبر یا حشر کی ظلمتوں میں نور ہوگا) وغیرہ۔

یوں تو قرآن مجید کی ہر سورت مقدس اور مبارک ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی تاریخ کو اس کا پڑھنا باعث برکت ہے (بشرطیکہ کوئی اور شرعی مانع نہ ہو) اور رمضان المبارک میں تو نفل عبادت کا ثواب دیگر ایام کے فرائض کے برابر ہوتا ہے، لہذا اگر کچھ لوگ ستائیسویں شب کو ”سورۃ الروم“ اور ”سورۃ العنکبوت“ پڑھتے ہیں یا حسب توفیق اور بھی سورتیں پڑھیں تو بلاشبہ یہ اجر و ثواب اور سعادت کی بات ہے لیکن تعین شرعی کی نیت سے پڑھنا درست نہیں ہے۔

تعین شرعی سے مراد ہے کوئی یہ عقیدہ رکھے کہ خاص اس رات کو یہ سورتیں پڑھنے کا حکم دیا ہے یا یہ کہ اس دن دوسری سورتوں کے مقابلے میں ان کا زیادہ ثواب ہے یا یہ کہ یہ شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام کا خاص معمول تھا درست نہیں ہے۔